غالب عرفان اور تخلیقی وجدان



سیدؒ مسعود اعجاز بخاری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غالب عرفان اور تخلیقی وجدان

(اردو شاعری میں غالب عرفان کا کردار اور مقام و مرتبہ)

سیّد مسعود اعجاز بخاری

نام کتاب : غالب عرفان اور تخلیقی وجدان
(اردو شاعری میں غالب عرفان کا کردار اور مقام و مرتبہ)

مصنف : سید مسعود اعجاز بخاری

کمپوزنگ : الحمد گرافکس

سن اشاعت : 2015

تعداد : 500

قیمت : 400روپیہ

اشاعت و پیش کش: غالب عرفان' کراچی

طباعت : ذکی پرنٹرز' کراچی

ملنے کا پتا:

سائبان' آر-۲۶۳' سیکٹر ۸ نارتھ کراچی' کراچی ۷۵۸۵۰

Cell:033-33137181

3496 7952

الحمد پبلیکیشنز

C-1 حیدر پلازہ' گلشن چورنگی' گلشن اقبال' کراچی

فون: 0322-2830957

email:alhamdpublications@hotmail.com

غالب عرفان ۴۰ سال پہلے



ہوں اِک وجود کہ خوابِ رواں کے معلوم
سفر میں، مَیں ہوں کہ تظمِ جہاں کے معلوم
وہ میرا عکس ہے یا اک گماں کے معلوم
ٹھہر گیا ہے کوئی درمیاں کے معلوم

غالب عرفان

کوئی بھی نہ بچ سکا جشنِ فتح کے لیے
شہر کی فصیل پر طبلِ جنگ رہ گیا
غالب عرفان

انتساب

عظیم تر پاکستان کے نام

اتحاد عالمِ اسلامی کے نام

اس لیے کہ

اتحاد عالم اسلامی کا

منطقی نتیجہ

امنِ عالم کا قیام ہے

حسنِ ترتیب

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر

☆......☆

مقدمہ

انسانی تاریخ کا یہ خاصا رہا ہے کہ اس نے ہر دور میں انسانوں کی راہنمائی اور انسانیت کی بھلائی کے لیے ایسی ایسی عظیم وذی وقار شخصیات کو جنم دیا جو اپنے فکر وفن اور حسن وکردار سے اس جہانِ رنگ وبُو میں ایسے گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑ کر انمٹ اس میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ بیشتر لوگوں نے ان کی حکیمانہ بصیرت، رشد مندی اور تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے نہ صرف اپنی زندگیاں سنواریں بلکہ اس دور اور خطہ کو چار چاند لگا دیئے یوں لوگ ان عدیم الشان ہستیوں کے کارناموں سے تا ابد استفادہ کرتے رہیں گے۔

زیرِ نظر کتاب غالب عرفان اور تخلیقی وجدان "اردو شاعری میں غالب عرفان کا مقام ومرتبہ" مملکتِ خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کی انتہائی حساس نظریاتی شخصیت وفلسفی شاعر، ادیب، محقق، نقاد، استاذ الاساتذہ جناب سیّد مسعود اعجاز بخاری (جن کا تعلق میر پور آزاد جموں وکشمیر سے ہے) کمالِ مہارت اور دل آویز صورت میں احاطہ تحریر میں لائے ہیں۔ بخاری صاحب کا جذبہ حُب الوطنی بھی نہ صرف اپنی مثال آپ ہے بلکہ عدیم المثال ہے۔ آپ نے کتاب ہٰذا کا انتساب بڑے ہی جاندار پیرائے میں لکھا ہے، ملاحظہ ہو۔۔۔

"عظیم تر پاکستان کے نام...... اتحادِ عالم اسلام کے نام......

اس لیے کہ اتحادِ عالم اسلامی کا منطقی نتیجہ امنِ عالم ہے۔"

اہلِ قلم اور اہلِ ذوق حضرات اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جناب سیّد مسعود اعجاز بخاری نے اس علمی وتحقیقی کتاب کو تحریر کرنے اور منظرِ عام پر لانے میں کتنی محنت کی ہوگی......؟ نجانے کتنا قیمتی وقت صرف کر کے ان تمام تحقیقات ومعلومات کا موازنہ کر کے غالب عرفان کو احاطہ تحریر لایا ہوگا......؟ بقول مرزا اسد اللہ غالب

؎ آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک

سید مسعود اعجاز بخاری صاحب نے اس علمی و تحقیقی کتب کو گیارہ ابواب میں کچھ یوں منقسم کیا ہے (1) غالب عرفان.....سوانحی پس منظر (2) غالب عرفان کی اصناف سخن اور اُن کا وژن (3) غالب عرفان کی آزاد نظمیں (4) غالب عرفان ایک انقلابی مزاحمتی فنکار و دانشور (5) غالب عرفان کے ہاں لفظیات، تراکیب، بندشوں، تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کا استعمال (6) غالب عرفان کی حب الوطنی اور قومی تشخص کا احساس (7) غالب عرفان کی نمائندہ غزلیات (8) غالب عرفان مشاہیر کی نظر میں (9) خود مرکزیت، رومانوی شاعری اور غالب عرفان (10) غالب واقبال اور غالب عرفان (11) اُردو شاعری میں غالب عرفان کا کردار اور مقام و مرتبہ۔

اِن مذکورہ ابواب کی روشنی میں غالب عرفان کی سحر انگیز شخصیت چودھویں کے چاند کی طرح نکھر کر سامنے آئی ہے اور تشنگانِ علم و ادب کے لیے مشعلِ راہ دکھائی دیتی ہے۔ سید مسعود اعجاز بخاری غالب عرفان اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو نقادانہ اور محققانہ کسوٹی پر پرکھ کر ایک نئے غالب عرفان کو منظرِ عام پر لائے ہیں۔جس غالب عرفان کو خود غالب عرفان تلاش کر رہے تھے ''سفر کی شام ہوتی جارہی ہے'' کے عنوان سے لکھے مضمون میں غالب عرفان کچھ یوں رقمطراز ہیں......

''ہاں میں اپنی یہ تفصیل لکھتے لکھتے ذرا جذباتی اس لیے ہو گیا کہ شاید کوئی دیانت دار صاحب نظر تاریخ کے جبر میں پھنسے ہوئے مجھ جیسے انسان کے اندر چھپے ہوئے اُس شاعر کو تلاش کر سکے جسے غالب عرفان کہتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے غالب عرفان کی اس دُعا کو شرف قبولیت کا درجہ بخشا۔ اور وہ اسی مذکورہ بالا مضمون میں کچھ یوں رقمطراز ہیں......

''یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ محترم بخاری صاحب (سید مسعود اعجاز بخاری) کو میری شاعری اور شاعری میں چھپا ہوا ایک آدمی اتنا پسند آیا کہ وہ میری شاعری اور شخصیت پر ایک مربوط وجامع کتاب لکھنے کی زحمت بھی کر رہے ہیں۔''

الحمدللہ، اللہ تبارک تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے غالب عرفان کی دیرینہ خواہش زیرِ نظر کتاب کی صورت میں پوری ہو گئی ہے۔ غالب عرفان اسم بامسمّی ہیں۔ وہ علم و ادب کے میدان

میں مکمل گرفت کے ساتھ اس نہج پر کھڑے ہیں اور انسانیت کی اس معراج پر فائز ہیں جہاں سے ان کے غالب ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ وہ عرفان بھی ہیں جو علم و ادب کی تمام اصناف سے بخوبی آگاہ ہیں اور ان پر مکمل دسترس بھی رکھتے ہیں۔

''غالب عرفان...... سوانحی پس منظر'' کے عنوان سے سید مسعود اعجاز بخاری نے کمالِ مہارت اور خوبصورت سے مختصر مگر جامع غالب عرفان کا سوانحی خاکہ پیش کیا ہے۔ جو کہ تشنگانِ علم و ادب کی تحقیقی وفنی ضروریات کو پوری کرتا ہے۔ اس سوانحی خاکہ کا بیشتر حصہ بخاری صاحب نے غالب عرفان کے لکھے ہوئے مضامین سے لیا ہے۔ ان مضامین کا مطالعہ کر کے قاری یہ کہنے میں حق بجانب ہو جاتا ہے کہ غالب عرفان جتنے اچھے شاعر ہیں اُتنے ہی اچھے نثر نگار بھی ہیں۔

''غالب عرفان کی اصنافِ سخن اور ان کا تخلیقی وژن'' میں بخاری صاحب نے بڑے ہی خوبصورت اور دلکش انداز میں غالب عرفان کی اصنافِ سخن اور اُن کے تخلیقی وژن کو جلا بخشی ہے۔ ملاحظہ ہو......

''ان کا اظہاراتی وژن خاصا وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ قومی و ملی اور بین الاقوامی موضوعات کو انہوں نے بڑی خوبصورتی اور چابکدستی کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی قومی و ملی تحقیقات اور انفرادی و بالکل ذاتی حوالے سے بھی وسیع اظہاراتی ناظر اور غیر معمولی مشاہداتی وژن کا احساس جلوہ گر ہوتا ہے ایک مقام تو ایسا آجاتا ہے کہ دروں بینی و بیروں بینی کی دوئی کا احساس بھی مٹ جاتا ہے۔''

''غالب عرفان کی آزاد نظمیں'' کے عنوان سے جناب سید مسعود اعجاز بخاری غالب عرفان کی آزاد نظم کے بارے میں لکھتے ہیں......

''نظمیہ اظہار بھی خاصے کی چیز ہے بلکہ پابند منظومات کی بہ نسبت آزاد نظم زیادہ خوبصورت، رواں دواں، شعور سے آراستہ اور متاثر کن ہے۔''

''غالب عرفان ایک انقلابی مزاحمتی فنکار اور دانشور'' کے عنوان سے بخاری صاحب غالب عرفان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو بڑے ہی جاندار اور مدلل انداز میں پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو......

''غالب عرفان استحصال کارانہ طرزِ فکر وعمل کے شدید مخالف ہیں ان کی تخلیقی کاوشیں ردِعمل اور مزاحمت کا بڑا خوبصورت اظہاریہ ہیں۔ ردِعمل سے تلخی جنم لیتی ہے۔ کبھی تو ردِعمل محض تلخی تک

پہنچ جاتا ہے پھر احتجاج وقوع پذیر ہوتا ہے اور احتجاج جب فکر و شعور کی ہمراہی میں آگے بڑھتا ہے تو نظریہ بن جاتا ہے پھر وہ ردِ عمل کی قوتیں نظریے کی ہمراہی میں مزاحمتی رُوپ دھار لیتی ہیں۔ جوشؔ زبان و بیان کے تمام تر وسائل ہوتے ہوئے محض احتجاج کے شاعر بن سکے۔ غالب عرفاں، اپنے عہد کا خود ہی موجد اور خود ہی خاتم، کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ ہفت آسمان پر مکین اور براجمان دو ہستیوں غالبؔ و اقبالؔ سے برابر فیض یاب ہوئے۔ تخلیق اور دانش و ادراک کی ساری قوتیں اور وسائل تخلیقیہ کے ساتھ اپنے جہاں کا مکین ہے۔ اس طرح وہ نئی صوفیانہ تخلیقی شعری روایات کا غماز بن جاتا ہے۔ نہ وہ کسی کے مماثل اور نہ کوئی اس سے ہم رنگ۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مجھے یہ خوشی اور طمانیت ہے کہ اس عہد میں وہی میرا دوست ہے۔ غالب عرفاں کا کلام شدید مزاحمتی توانائیوں سے بھرپور ہے۔"

"غالب عرفاں کے ہاں لفظیات، تراکیب، بندشوں، تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کا استعمال" میں سید مسعود اعجاز بخاری کھلے دل سے ان کے تخلیقی وژن کی ترجمانی کرتے ہیں، ملاحظہ ہو ......

"غالب عرفاں کے غیر معمولی تخلیقی وژن نے جب اظہار کی صورت اختیار کی تو زبان کا استعمال روایتی ہرگز نہیں بلکہ ان کے ہاں لسانی استعاراتی تازہ کاری کا متاثر کن اور خوشگوار احساس جلوہ گر ہوتا ہے۔ بندشوں، تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کا استعمال انہیں لسانی خدمات کا امین بھی بنا دیتا ہے۔ ان کی تخلیقی کاوشیں نئی فطری اور لسانی تشکیلات کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔"

غالب عرفاں نے جہاں شاعری میں بندشوں، تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کا استعمال مہارت اور خوبصورتی سے کیا ہے وہیں انہوں نے نثر میں بھی اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ "میں رنگ کی بات کر رہا ہوں۔" کے عنوان سے مضمون میں کیا ہی خوبصورت نثر لکھی ہے، ملاحظہ ہو......

"ان مشاعروں کی گہما گہمی میں ہی میری ملاقات ایک اور تخلص نظام الدین سے ہوئی جن کو شاعری کے ذوق نے شاعر بنا کر دم لیا اور یوں صبح کے بھولے شام کے "رنگِ شفق" میں گھر لوٹے تو اپنا تخلص بھی "شفق" رکھ لیا۔"

"کبھی یہ سوچ کر بھی میں پتھر بن جاتا ہوں کہ اگر شاعری میرا ساتھ نہ دیتی تو مجھ جیسا

حساس آدمی زندہ کیسے رہتا؟"

"کراچی پہنچنے کے بعد میں نے جب اپنے وجود کا بکھرا ہوا ریزہ ریزہ سمیٹنا شروع کیا تو ایک بار پھر شاعری میرے لیے "شجر ممنوعہ" بنی رہی۔"

غالب عرفان میں جذبہ حب الوطنی بدرجہ اتم کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جس کا ان کی شاعری اور نثر سے برملا ثبوت بھی ملتا ہے۔ "غالب عرفان کی حب الوطنی اور قومی تشخص کا احساس" کے عنوان سے سید مسعود اعجاز بخاری بڑے دل موہ لینے والے انداز میں ان کی حب الوطنی کی غمازی دکھائی دیتے ہیں، ملاحظہ ہو......

"غالب عرفان بھی تخلیق کاروں کی جمعیت کے ایک اہم فرد ہیں وہ خود سانحہ مشرقی پاکستان میں ابتلاو آزمائش کی گھڑی میں جو قیامت ٹوٹی اس میں وہ بھی متاثر ہوئے۔ بقا کی اس جنگ میں انہوں نے اپنا چھوٹا بھائی قربان کر دیا۔ ان کی غزل و نظم ہر تخلیقی اظہاریہ میں اس واقعہ کی گہری چھاپ ہے وہ ایک بے حد محب وطن اور انسان دوست شخصیت ہیں۔"

"غالب عرفان کی نمائندہ غزلیں" کے عنوان سے بخاری صاحب نے اپنی محققانہ اور نقادانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کٹھن اور دشوار گزار کام کو انتہائی احسن اور خوبصورت طریقے سے انجام تک پہنچایا ہے۔ جہاں یہ غزلیں غالب عرفان کی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کی نمائندگی کرتی ہیں وہیں سید مسعود اعجاز بخاری کی خداداد صلاحیتوں اور ان کی محققانہ و نقادانہ فنی صلاحیتوں کی ترجمانی کرتی ہیں کہ بخاری صاحب نے کس قدر محنت، لگن سے ان غزلیات کا انتخاب کر کے غالب عرفان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اوجِ ثریا پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس پر ہر دو شخصیات خراجِ تحسین کی مستحق ہیں۔

"غالب عرفان مشاہیر کی نظر میں" کے عنوان سے بخاری صاحب نے اُن تمام مشاہیر کو احاطۂ تحریر میں لایا ہے جنہوں نے غالب عرفان اور اس کی شاعری پر اپنی گراں قدر آرا لکھی ہیں۔ ان مشاہیر میں ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، محسن بھوپالی، شاگور کھپوری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی، حکیم محمد سعید، سید مسعود اعجاز بخاری، ڈاکٹر عاصی کرنالی، پروفیسر محمد فیروز شاہ، وزیری پانی پتی، ڈاکٹر پروفیسر فاروق احمد، عشرت رومانی، پروفیسر غفار شاد، تنویر پھول، ڈاکٹر حلیم

اختر، ڈاکٹر وزیر آغا، شبنم رومانی، کالی داس رضا گپتا، اختر پیامی، افسر ماہ پوری، صبا اکرام، شفیق احمد شفیق ڈاکٹر انور سدید، میرزا ادیب، ڈاکٹر جمال نقوی، تشنہ بریلوی، ڈاکٹر اسلم فرخی، پروفیسر رؤف خیر، رؤف نیازی، ڈاکٹر رشید نثار، سابق بھارتی وزیر اعظم اندر کمار گجرال اور محسن اعظم ملیح آبادی شامل ہیں۔ ان مشاہیر کی آراء کی روشنی میں غالب عرفان کی شخصیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

''خود مرکزیت، رومانوی شاعری اور غالب عرفان'' کے عنوان سے بھی بخاری صاحب نے غالب عرفان کے بارے میں خوب لکھا ہے ......

''خود مرکزیت اور رومانوی شاعری کا ایک بڑا اور خاص وصف تصور کی جاتی ہے جو کہ بڑے ادب کی تخلیق میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ دُنیا کے بڑے رومانوی شعراء اور یورپ کے رومانوی مفکرین اور فلسفیوں کی طرح غالب عرفان کے کلام میں آزادی کی تڑپ اور عالمی امن کے قیام کی خواہش، نوعِ انسانی سے ہمدردی، ظلم واستیصال اور جبر وتشدد کے خلاف بغاوت اور مزاحمت اور وطن کی محبت کا جذبہ موجزن ہے۔ کتاب ہذا کا ایک اہم باب بعنوان ''غالب و اقبال اور غالب عرفان'' ہے اس باب میں بخاری صاحب نے غالب عرفان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خالصتاً ادبی انداز میں پرکھا تو انہوں نے غالب عرفان کی شاعری میں مرزا اسد اللہ غالب اور مسلم فلسفی شاعر اعظم حضرت ڈاکٹر علامہ اقبال جیسی انسانیت اور وطن کے لیے تڑپ محسوس کی تو انہوں نے اس پر برملا اظہار کرتے ہوئے کتاب ہذا میں اس کو مذکورہ بالا عنوان سے شامل کر لیا۔

''اُردو شاعری میں غالب عرفان کا کردار اور مقام و مرتبہ'' یہ کتاب ہذا کا آخری باب ہے۔ اس باب میں سید مسعود اعجاز بخاری نے قلم وقرطاس سے خوب انصاف کرتے ہوئے غالب عرفان کی علمی وادبی خدمات اور مقام و مرتبہ کو احاطۂ تحریر میں لا کر غالب عرفان کو تاریخ میں امر کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو......

''حضرت غالب کی شاعری انسانی جذبات واحساسات کا ایک بڑا محشرستان ہے گویا وہ ایک آئینہ خانہ ہے جہاں ہر سو غالب ہی غالب نظر آتے ہیں۔ ایک طرف اقبال ہیں جن کی صحیح عظمت اور وسعت فکر وفن کا اندازہ شاید آنے والے زمانوں میں بھی ممکن نہ ہوگا۔ اگر ایک طرف

آپ ہیں کہ آپ کے ہاں انسانی شکست و ریخت اور انسانی دوستی سے اُبھرنے والا رفیع الشان منظر نامہ اپنی پوری تابناکی کے ساتھ تہذیبی فلاسفی کا غماز بن جاتا ہے۔ فقیر کے نزدیک آپ کا انحصار نئی شعری، تہذیبی اور صوفیانہ فلاسفی کی وقوع پذیری میں مضمر ہے۔ فقیر کے نزدیک یہ اُردو زبان وادب کی تیسری بڑی کامیابی اور خوش بختی ہے۔ یہ حیثیت عالمی ادب میں واحد کا مرانہ انسانی وتخلیقی عمل ہوگا۔"

اب رہتی دُنیا تک بنی نوع عالم اس کتاب کی روشنی میں غالب عرفان کی خداداد صلاحیتوں سے مستفید ہوتی رہے گی۔ تشنگانِ علم وادب اور طالب علموں کے لیے علم وادب کے میدان میں راہیں وسیع ہوگئی ہیں جن سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنی منزل مقصود کا تعین کرسکیں گے۔

قارئین کرام ہم نے طوالت کے پیشِ نظر غالب عرفان کے کسی بھی شعر کو موضوع سخن نہیں بنایا حالانکہ اگر ان کے اشعار، نظموں اور غزلوں کو ہم کوٹ کرتے تو اور اس کی تشریح کرتے تو شاید ہماری تحریر اصل کتاب سے بڑی ہوجاتی۔ اس لیے آخر میں ہم صرف ایک شعر کے مصرعہ کو موضوع سخن بنارہے ہیں جو کہ اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے آفاقی معلوم ہوتا ہے۔ اس مصرعہ میں ایک خاص نکتہ کی بات ہے شاید کسی کی سمجھ میں آجائے ملاحظہ ہو......

ے برنگِ کعبہ ہر اک سلسلہ طواف میں ہے

ایسا آفاقی شعر غالب عرفان جیسے خوش نصیب شعراء کے حصہ میں ہی آتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس رُوحِ زمین کی ہر حقیر سے حقیر تر اور بڑی سے بڑی چیز گردش میں ہے اور کعبہ شریف یہ وہ جگہ ہے جب اللہ تبارک وتعالیٰ زمین بنانے لگے تو اس جگہ سے زمین کی ابتداء ہوئی جس کا اظہار ہم محمد ندیم عمر صاحب کی کتاب "تاریخ اُم القریٰ" کے تبصرے میں کرچکے ہیں۔ ملاحظہ ہو......

قرآن کریم فرقان حمید ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ " بے شک سب میں پہلا گھر، جو لوگوں کی عبادت کے لیے مقرر ہوا، وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور سارے جہان کا راہنما۔"......(سورۃ آلِ عمران......آیت نمبر: 96)۔ علمائے کرام اس آیت مبارکہ کی شانِ نزول کی تفسیر کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ "یہود نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ بیت المقدس ہمارا قبلہ ہے، کعبہ سے افضل اور اس سے پہلا ہے، انبیاء کا مقامِ ہجرت وقبلہ عبادت ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ کعبہ افضل ہے،

اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور اس میں بتایا گیا کہ سب سے پہلا مکان جس کو اللہ تعالیٰ نے اطاعت وعبادت کے لیے مقرر کیا، نماز کا قبلہ حج اور طواف کا موضع بنایا جس میں نیکیوں کے ثواب زیادہ ہوتے ہیں، وہ کعبہ معظمہ ہے، جو شہر مکہ معظمہ میں واقع ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ کعبہ معظمہ بیت المقدس سے چالیس سال قبل بنایا گیا'' ......(فیضان القرآن، ترجمہ: کنزالایمان، تفسیر: خزانہ العرفان، صفحہ نمبر: 91)۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ ''آسمان وزمین کی پیدائش کے زمانے میں پانی کی سطح سے سب سے پہلے کعبہ شریف کا مقام نمودار ہوا، پھر اس کے بعد زمین اس کے نیچے پھیلائی گئی'' ......(معرفت کعبہ صفحہ نمبر:5)۔ متذکرہ بالا قرآن حکیم فرقان حمید کی آیت مبارکہ اور روایت کی روشنی میں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ کائنات ارضی کے وجود میں آنے کے وقت سب سے پہلے کعبہ معظمہ والی جگہ منظر عام پر آئی اور پھر اس کے بعد ساری کائنات اس جگہ سے بچھائی اور پھیلائی گئی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کرۂ ارض پر سب سے پہلے مکہ معظمہ میں کعبہ شریف ہی کو لوگوں کی عبادت وہدایت کے لیے منبع رحمت بنایا گیا اور پھر یہاں سے کرنیں پھوٹ کر پوری کائنات میں پہنچیں۔ اس اعتبار سے مکہ معظمہ قدیم ترین اور اولین مقام ہے جو اس کائنات ارضی پر وجود میں آیا۔

آخر میں ہم ہر دو شخصیات سید مسعود اعجاز بخاری اور غالب عرفان کو ان کی علمی وادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ یونہی علم وادب کی خدمت کرتے رہیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کا اقبال بلند کرے...... آمین!!!

راجہ عدیل بھٹی
صدر نشین (عرشِ سخن)
جنرل سیکریٹری: مجلسِ فکر ودانش
ایڈیٹر: ماہنامہ روہتاس رنگ
03345073533

☆......☆

تقریظ

غالب عرفان جمشید پور سے چاٹگام اور پھر کراچی تک جہد مسلسل اور جن حوادث سے دوچار ہوئے انہوں نے گویا ان کی شخصیت کو نئے سرے سے نئے سانچے میں ڈھال کر اُبھارا۔ ان کا یہ سفر نہ صرف عرفانِ ذات اور شعور وادراک کا سفر ثابت ہوا بلکہ یہ سفر تاریخ ساز اور اپنے عہد کی تلخ و ترش تاریخ بھی ثابت ہوا۔ گویا غالب عرفان کانِ سخن کا وہ ہیرا تھا جسے پے درپے حوادث کی نپی تلی ضربوں نے تراش کر ایک خیرہ کن چمک دمک سے نواز دیا۔ ہر نئی چوٹ نے ایک نیا آہنگ بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب عرفانؔ نہ صرف اس شورشِ جاں پر غالب آ گئے بلکہ ان کی آواز ایک عہد اور ایک تہذیب کی صدا بن کر گونجنے لگی۔

اس تہذیبی ورثے کو جناب سید مسعود اعجاز بخاری نے بڑی خوبصورتی سے یکجا کر کے قارئین کے لیے کحل البصر بنا دیا ہے، جو پڑھے گا اس کی آنکھیں بھی روشن ہوں گی اور دل و دماغ کے دریچے بھی وا ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا انتساب بھی ان کے جذبات واحساسات کا عکاس ہے۔ ”عظیم تر پاکستان کے نام“۔ ”اتحاد عالم اسلامی“ اور ”امن عالم“ کے الفاظ سے ہی ان کے نیک جذبات مترشح ہو جاتے ہیں۔

تاریخ کے دوراہے پر تہذیب کے ہاتھوں
انسان کو اتنا کبھی ششدر نہیں دیکھا
آئینے نے چہرے کا سکوں دیکھا ہے لیکن
پیوست کوئی پشت میں خنجر نہیں دیکھا
تخریب سے تعمیر کی ہر جنگ میں عرفانؔ
تدبیر نے تقدیر کو مڑ کر نہیں دیکھا

غالب عرفانؔ نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کے ساتھ بھی بھرپور انصاف کیا اور بڑی روانی

اور بے ساختگی سے اپنے ملک اور اپنے شہر میں ہونے والے واقعات پر اپنے دلی جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔کوئی دہشت گردی کا واقعہ ہو یا زلزلے کی تباہی کا 'قتل انسانیت ہو یا انصاف کا قتل' ان کے قلم کی ناقدانہ نوک سے نہیں بچ پایا ہے۔

انجم سلطان شہباز
ماہر تعلیم و مؤرخ پاکستان
0300-5412374

باب ا

سوانحی پس منظر

ان کی حیات کا ایک ایک ورق اور تفصیلات ہم انہی سے معلوم کرتے ہیں۔ اپنی پہلی کتاب ''آ گہی سرا ہوئی'' میں وہ رقم طراز ہیں:۔

مئیں رنگ کی بات کر رہا ہوں

''میں نے عرضِ حال کے لیے یہ عنوان اس لیے بھی رکھا ہے کہ اہلِ نظر میری زندگی کے حالات کے پس منظر میں میری غزل کے صحیح رنگ کا ادراک کر سکیں گے۔ لیکن آج جب میں اپنے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو یہ مرحلہ مجھے شعر کہنے سے زیادہ مشکل نظر آ رہا ہے کیونکہ ویسے بھی اپنے بارے میں لکھنا دوسروں کی داستان سنانے سے بہت کٹھن ہے۔

میرا آبائی وطن یوں تو دکن کی سانولی سلونی سرزمین ہے لیکن میں نے اپنی ابتدائی' ثانوی اور کالج کی تعلیم جمشید پور کے شہر آتش و آہن میں حاصل کی ہے۔ اور میری رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے اس میں شعر و ادب کا حسین جذبہ میرے والد مرحوم کے اعلیٰ اور صاف ستھرے شعری ذوق کا رہین ہے۔ ابا جی کو ہزاروں اشعار زبانی یاد رہا کرتے تھے جنھیں وہ اکثر و بیشتر نجی محفلوں میں بروقت سُنا کر اپنے دوستوں سے داد و صول کیا کرتے تھے میری ذہنی تربیت میں اُن کی خوش ذوقی اور نفاستِ طبع کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اُن سے بچھڑنے کے تقریباً سترہ سال بعد بھی آج میں اپنے آپ کو کھویا کھویا سا محسوس کر رہا ہوں۔

میرے ادبی شعور نے اپنی آنکھیں اس وقت کھولیں جب میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا! عجب ماحول تھا وہ!! اُردو شعبے میں پڑھنے والے مسلمان لڑکوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی

ہوا کرتے تھے جن کی مادری زبان بھی اُردو تھی اور ہمارے کلاس ٹیچر بدیع الزماں مائل (مرحوم) جو اپنی کلاس میں حساب اور تاریخ کا پیریڈ لیا کرتے تھے نہ صرف ایک ممتاز ترقی پسند شاعر تھے بلکہ شہر جمشید پور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک اعلیٰ عہدیدار بھی تھے اُن کی قیام گاہ پر شاعروں کا جمگھٹا ہوا کرتا تھا اور ایک مرتبہ تو جوش ملیح آبادی سے ملاقات کا شرف مجھے ان ہی کی رہائش گاہ پر حاصل ہوا تھا۔ مڈل اسکول میں ایک اور ٹیچر بھی جن کا نام ممتاز علی (مرحوم) تھا میری شاعرانہ طبیعت کا ممد و معاون ثابت ہوئے اور اس طرح میرے ذوق مطالعہ نے مجھے لکھنے لکھانے پر اُکسایا۔

جمشید پور کی گلیاں اور بازار میرے بچپن ولڑکپن اور نوجوانی کی یادوں کی اَن مٹ یادوں کی امین ہیں کیونکہ ویسے بھی اس شہر کی حیثیت ایک میٹروپولیٹن (COSMO OPOLITIAN) کی سی تھی۔ جہاں آج تک مختلف اقوام کے افراد روزگار کی تلاش میں آتے ہیں اور وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہاں آج کے اور اُس زمانے کے جمشید پور میں جو واضح فرق ہے وہ وہی ہے جس نے مجھے وہاں سے مشرقی پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کیا! کاش یہ فرق موجود نہ ہوتا!

ایک صنعتی شہر کا ماحول جہاں سنگ آہن سیال بن کر فولاد بن جاتا ہو جہاں کی گرم و مرطوب آب و ہوا بارش کے دنوں میں بھی حبس پیدا کرتی ہو۔ جہاں کے عوام کا اکثریتی طبقہ نسبتاً کم پڑھے لکھے مزدوروں پر مشتمل ہو، جہاں ذہنی تربیت کے مواقع کم ہوں اور جسمانی مشقت کے مناظر زیادہ دیکھنے میں آئیں، وہیں میری طبیعت کی حساسیت نے مجھے ایسا ماحول عطا کیا کہ میرے قلم کی جنبش کو میرے اندر چھپے ہوئے تخلیق کار کی تلاش ہوئی اور میں نے اپنے لکھنے کے عمل کا آغاز نثر سے کیا۔ پہلا مضمون ہائی اسکول کے میگزین میں شائع ہوا تو میرے اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور دوستوں کی ستائش نے مجھ میں خود اعتمادی کی جوت جگائی۔ اس مضمون کا عنوان تھا۔ ”آزادی سے پہلے“ لیکن لکھا گیا آزادی کے کئی سال بعد..... اور اس طرح اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ کبھی نثر میں اور کبھی نظم میں میں اپنے آپ کو تلاش کرتا رہا، جذبات اُبھرتے رہے قلم کبھی چلتا کبھی رُکتا رہا اور

پھر گھریلو حالات نے مجھے تلاشِ معاش کے شکنجوں میں جکڑ لیا اس طرح رفتہ رفتہ میں اپنی اس صلاحیت سے غافل ہوتا چلا گیا۔

شادی کے بعد ابھی ہم میاں بیوی پر ایک دوسرے کے اعتماد کی فضا پوری طرح حاوی بھی نہ پائی کہ شہر آتش و آہن ہندو مسلم فسادات کی زد میں آ گیا وحشت ناک اور خون ریز فسادات نے ترکِ وطن پر مجبور کیا اور ہم سابقہ مشرقی پاکستان کے شہر چٹا گانگ پہنچے جو ایک ساحلی شہر تھا لیکن بندرگاہ ہونے کی وجہ سے صنعتی مزاج بھی رکھتا تھا۔ میں جب چاٹگام پہنچا تو اپنا سب کچھ نذرِ فسادات کر چکا تھا لہٰذا اگر میں وہ سب کچھ لکھنے لگوں جو مجھے تلاشِ روزگار کے سلسلے میں پیش آیا تو پھر "آگہی سزا ہوئی" کے سارے صفحات بھی کم پڑ جائیں اور داستان مکمل نہ ہو پائے۔

حصولِ روزگار کے بعد جب زندگی میں کچھ قرار آیا تو اقتصادی استحکام کے ساتھ ساتھ اولاد میں بھی برکت ہوتی گئی اور میں وقتی طور پر اپنی شاعری بھول کر بچوں کی بہتر سے بہتر پرورش و پرداخت میں مصروف ہو گیا اور ابھی میرے قدم چاٹگام میں اچھی طرح جمنے بھی نہ پائے تھے کہ ملک کا پورا مشرقی حصہ آگ و خون کی لپیٹ میں آ گیا۔ آدمی درندہ ہو گیا یا درندگی نے آدمی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا یہ طے نہ ہو سکا۔ انسان کی جان اتنی سستی ہو سکتی ہے اور مذہب ایک کمزور ترین رابطہ بن کر ہمارا منہ چڑا سکتا ہے۔ یہ کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا انسان کی جان اور اس کی عزت دونوں ایک ساتھ تنگ نظری کی نذر ہو گئے اور میں نے ہر موڑ پر آدمیت کا ننگا ناچ یہاں وہ دیکھا کہ مجھے خود اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ اپنے انسان ہونے پر پچھتاتا رہا۔ میں نے بیوی اور بچوں کے ساتھ عزت کس طرح بچائی اور کرب و اذیت کا یہ عرصہ طویل تھا یا مختصر یہ سب ذہن میں لمحہ بہ لمحہ محفوظ تو ہے لیکن لفظوں کا لبادہ اوڑھنے سے قاصر ہے! میرا نوجوان شادی شدہ بھائی جو مجھ سے تقریباً دس برس چھوٹا تھا اسی درندگی کی نذر ہو گیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور ہم سب مل کر کچھ نہ کر سکے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات زندگی کی بھیانک اور مہیب ترین شب ہم سب کے گھروں میں صفِ ماتم بچھا گئی۔ ہم سب ایک دوسرے سے گلے مل کر پھوٹ

پھوٹ کر روتے رہے لیکن دلاسہ دینے والا کوئی نہ تھا یہ سانحہ کوئی معمولی سانحہ تو نہیں تھا کہ ہم فوراً سنبھل جاتے۔ ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی گئی تھی جہاں ہم رہتے تھے وہاں پچیس تیس ہزار خاندانوں پر مشتمل کالونی تھی ہم محصور کر دیئے گئے تھے پانی بجلی اور اناج کی فراہمی روک دی گئی تھی۔ وہاں امراض پھوٹ پڑے تھے لوگ کچھ تو کثیر باہنی کا شکار ہوتے رہے کچھ وبائی امراض کا اور کچھ اپنوں کی بے مروتی کا۔ کفن دفن کا انتظام کرنے کے لیے حصار توڑ کر باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی بہرحال جتنے دن قید رہے اتنے ہی دن خالق کائنات نے ہماری حفاظت کی اور پھر آہستہ آہستہ گھٹن کی فضا میں باہر کی ہوائیں در آئیں اور پہلے دریچے پھر دروازے کھلتے گئے لیکن راہیں ابھی کھلی نہ تھیں۔ ایسے میں اس گھٹن کو دور کرنے کے لیے مجھ جیسے چند سر پھروں نے باذوق افراد کے تعاون سے چھوٹی چھوٹی شعری نشستوں کا انتظام کیا اور یہ نشستیں وقفے وقفے سے ہمارے گھروں میں ہونے لگیں۔ ان نشستوں کی خوبی یہ تھی کہ سامعین معمولی اشعار پر بھی داد دیا کرتے تھے اور مشاعرہ اپنے اختتام تک شباب پر رہتا تھا انہی دنوں میری ملاقات کاوش عمر صاحب سے ہوئی جن کی صدارت میں اکثر و بیشتر نشستیں ہوا کرتی تھیں اور جن کا شمار اُس وقت وہاں کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ کاوش عمر صاحب سے میں نے موقع غنیمت جان کر فنِ شاعری کے رموز حاصل کیے اور ایک مختصر لیکن اہم عرصہ اُن کے ساتھ بھی گزارا۔ اکثر و بیشتر ہم دونوں اپنی کالونی سے باہر کے مشاعروں میں بھی بلائے جانے لگے اور اس دوران یکے بعد دیگرے بہت سے شاعروں سے ملاقاتیں رہیں۔ چاٹگام میں قیام کے دوران جن مقبول شعراء سے تعلقات رہے اُن میں ولی صدیقی' کاشف رحیمی' طارق بناری اور مبارک مونگیری کے بعد کسی کے نام بھی مجھے اب تک یاد نہ رہ سکے لیکن ان تمام کے سوا ثناء اللہ ثنا سے میری جن حالات میں ملاقات ہوئی اُن حالات نے ہمیں ایک دوسرے کے شعری مزاج سے آشنا کیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ یہ وہی ثناء ہیں جو کراچی میں ثناء گورکھپوری کے نام سے اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے وقت میرے وجود میں جو انقلابی تبدیلیاں ہوئیں ان میں سب سے بڑی تبدیلی میرے قوتِ اظہار کی ہے۔ اس مرحلۂ جاں گسل کے بعد میں نے محسوس کیا کہ شاعری ہی صرف میرے دکھوں کا ساتھ دے سکتی ہے۔ یہاں کے بدلے ہوئے حالات اور حالات کے بدلتے ہوئے تیور نے مجھ سے بہت ساری نظمیں کہلوائیں اور بیشمار قطعات لکھوائے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک کی محصور زندگی میرے پاس میری شاعری کی صورت میں ایک تاریخ بن کر محفوظ ہوگئی تو یہ غلط نہیں ہے ان مشاعروں کی گہما گہمی میں ہی میری ملاقات ایک اور مخلص شخص نظام الدین سے ہوئی جن کو شاعری کے ذوق نے شاعر بنا کر دم لیا اور یوں صبح کے بھولے شام کے رنگِ شفق میں گھر لوٹے تو اپنا تخلص بھی شفق رکھ لیا۔ ان کے ساتھ میری ملاقاتوں نے رفتہ رفتہ گھریلو تعلقات کی شکل اختیار کی اور ان کی بیگم میری شمع باجی بن گئیں۔

پھر قسمت نے دوہری ہجرت کا کرب لکھا تھا اور جب جنوری ۱۹۷۴ء میں مَیں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی کی بندرگاہ پہنچا تو میرے پاس سوائے ایک سوٹ کیس کے پھوٹی کوڑی تک نہ تھی کہ زندگی کا نئے سرے سے آغاز کیا جائے۔

آج جو اپنی زندگی کے اس مرحلے پر پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے قدرت نے مجھ میں جدوجہد کی کتنی صلاحیت پوشیدہ رکھی تھیں کہ میں نے مر مر کے جینا سیکھا اور بکھر بکھر کر سمٹنا جانا' کبھی یہ سوچ کر بھی میں پتھر بن جاتا ہوں کہ اگر شاعری میرا ساتھ نہ دیتی تو مجھ جیسا حساس آدمی زندہ کیسے رہتا۔

کراچی پہنچنے کے بعد میں نے اپنے وجود کا بکھرا ہوا ریزہ ریزہ سمیٹنا شروع کیا تو ایک بار پھر شاعری میرے لیے شجرِ ممنوعہ بنی رہی لیکن یہ عرصہ بھی زیادہ طویل نہیں تھا کہ ۱۹۷۹ء میں ایک تپتی ہوئی دوپہر کو میری ملاقات نظام الدین شفق سے ہوئی اور اس کے بعد ایک روز شاہ سے بھی یونہی مڈبھیڑ ہوگئی۔ بیگم شفق یعنی شمع باجی کی خوش ذوقی نے دو ایک مرتبہ چھوٹے موٹے مشاعروں کی محفل بھی اپنے گھر برپا کی اور رفتہ رفتہ مَیں اور شاہ کبھی ایک ساتھ کبھی تنہا مشاعروں میں دیکھے

جانے لگے پھر مجھے ایسا لگا کہ میں اور میری شاعری دو الگ الگ عنصر نہیں بلکہ ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔

چھپنا چھپانا میرے لئے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا کیونکہ شاعری کی ابتداء سے آج تک میری پہچان میں میری نظموں اور غزلوں کی مسلسل اشاعت نے اہم رول ادا کیا ہے اور میں ہندو پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے ادبی اور نیم ادبی جریدوں کے علاوہ اخبارات کے ادبی صفحات پر تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا آ رہا ہوں اور اس طرح مجھے ایک حد تک یہ خوش فہمی (غلط فہمی) بھی ہے کہ کم از کم ادبی حلقوں میں میری اپنی ادبی شناخت تو ضرور ہے لیکن یہ شناخت میرے اس مجموعۂ کلام کی اشاعت کے بعد اپنے معیار کی کس حد تک تکمیل کرتی ہے یہ دیکھنا ناظرین کا کام ہے۔

میرے شعری لہجے میں سفا کی ہے یا تلخی یہ میں نہیں جانتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ اپنی شاعری میں رجائیت کو جگہ دی ہے۔ نہ میں زندگی سے مایوس ہوں اور نہ ہی میری شاعری میں مایوسی کی کوئی گنجائش! میری محرومیوں کی تلخی میرے اسلوب پر کس حد تک اثر انداز ہوئی ہے اور میں اپنی ذات کے بھنور میں کہاں تک ڈوب سکا ہوں اس کی تفصیل میں جائے بغیر بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کا مقدس ترین رشتہ بھی جب اقتصادی پسماندگی سے متصادم ہوتا ہے تو پھر انجام کار وجود کے وہ ریزے ہاتھ لگتے ہیں جن کو سمیٹنا ناممکن ہوتا ہے جس طرح خوش لباسی انسان کی خوشیوں کی ضامن نہیں ہوتی ٹھیک اسی طرح چہرے پر بکھرتی مسکراہٹ اُس کے وجود کے اندر چھپے ہوئے اذیت ناک کرب کا مظہر نہیں بن سکتی۔ کراچی شہر کے اقتصادی روپ میں چھپے ہوئے زہر نے جب مجھ پر اپنا بھرپور اثر دکھایا تو میں اندر سے کھوکھلا ہوتا گیا۔ ذمہ داریوں کے بوجھ اور رشتوں کے تقدس کی ٹوٹ پھوٹ نے مجھے ذہنی طور پر اتنی شدید اذیتیں دیں کہ میں جسمانی طور پر نت نئے عارضوں سے متعارف ہوتا گیا اور ان سے جنگ بھی کرتا گیا دیکھئے کب تک یہ جنگ جاری رہتی ہے اور آخری فتح کس کے نصیب میں لکھی ہے!

ہندوستان میں ہوش سنبھالنے کے بعد مجھے سب سے پہلے جس شاعر نے متاثر کیا وہ حکیم

الامت علامہ اقبال تھے شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ والد مرحوم کی کتابوں کے سرمائے میں ایسی کتابیں یا کتابچے زیادہ تعداد میں تھے جو علامہ اقبال کی نثری اور شعری تخلیقات پر مبنی تھیں۔ ویسے تو ہائی اسکول اور کالج کے زمانے میں مَیں نے غالبؔ اور میرؔ کا بھی مطالعہ کیا ہے لیکن میرے لڑکپن اور جوانی کا محبوب شاعر ساحرؔ لدھیانوی تھا۔ اور فیض احمد فیضؔ تو اکثر ہم طلباء کی گفتگو کا موضوع رہتے تھے۔ جدید شعراء میں شکیبؔ جلالی کی شاعری نے مجھے اس حد تک متاثر کیا تھا کہ ایک عرصے تک میں اس عظیم شاعر کے طلسم میں گم رہا۔

اب سب سے آخر میں وہ بات جو مجھے سب سے پہلے لکھنی چاہیے تھی یعنی اپنے دکھ سکھ کی ساتھی شریکِ حیات کے بارے میں۔ جنھوں نے میری زندگی کے ہر نشیب و فراز، ہر پیچ و خم، ہر خوشی و غم اور ہر فتح و شکست میں سراپا ایثار و وفا بن کر میرا ساتھ دیا اور شانہ بشانہ حیات کے ہر وحشت ناک موڑ پر میری رفیق بن کر مجھے مایوسیوں کے دلدل سے نکالتی رہی ہیں۔ میں اگر یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ میری شاعری کے اسباب تو کئی ہو سکتے ہیں لیکن میرے مجموعۂ کلام کی تکمیل کا باعث میری بیگم ہی ہیں کہ ان کے تعاون کے بغیر ''آگہی سزا ہوئی'' ایک کتابی صورت اختیار نہ کرتی۔

میری شاعری کو شوق سے پڑھنے والوں میں سب سے پہلے میری دونوں بیاہی بیٹیوں کے نام آتے ہیں اور اس کے بعد تیسری اور چوتھی بیٹیاں جو کبھی کبھی نقادوں کی طرح میرے کچے پکے اشعار پر اس طرح تنقید کرتی ہیں کہ انھیں مجھے دوبارہ کہنا پڑتا ہے۔ میرے فرزند کا البتہ اس طرف رجحان کم ہے کہ انھیں گھریلو مسائل نے بہت کم اس بات کا موقع دیا ہے پھر بھی شعروں کا اعلیٰ ذوق ان کی گھٹی میں شامل ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں میرے رفیق دیرینہ شاہ گورکھپوری نے جس خلوص کا اظہار کیا وہ حسب دوستاں در دل ہے اور محترم سید معراج جامیؔ اور محترم غیر ندیم کتابت سے اشاعت تک کے ہر مرحلے میں میرے ساتھ رہے۔ میں ان تمام کے شکریے کے ساتھ میری زندگی کے اس قیمتی سرمائے کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ دیکھیے اور فیصلہ

کیجیے کہ میرے شعروں میں میرے عہد کی کتنی سچائیاں کس حد تک موجود ہیں۔ میں اپنے قدر دانوں کے سامنے اپنا پہلا مجموعۂ غزل پیش کر رہا ہوں کیوں کہ میری پہچان غزل ہے لیکن شاعری کے اثاثے میں نعتیں اور موضوعاتی نظمیں بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں جو مناسب موقع پر اشاعت کی منتظر ہیں۔

غالب عرفان

یکم جنوری ۱۹۹۳ء

تحریر کہاں ٹھہرے!

میرا پہلا مجموعہ کلام جو غزلوں پر مشتمل تھا ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ اہلِ نظر نے میری شاعری کی میری توقعات سے پذیرائی کی۔ ''م'' نعتوں کا یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کی نظروں کے سامنے ہے' کائنات کی ایک عظیم ہستی کے لیے میری عقیدت کا ایک معمولی سا نذرانہ ہے جو اگر بارگاہِ رحمت العالمین تک پہنچ جائے تو زہے قسمت۔

میں نے اپنی زندگی کی پہلی نعت (صفحہ 60) ۱۹۷۲ء میں چاٹگام میں کہی تھی اور اُسے وہیں حالی شہر میں ایک جمِ غفیر کے درمیان عید میلاد النبیؐ کے موقع پر پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ اس نعتیہ مجموعہ میں شامل بیشتر نعتیں' بزرگ محترم ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی کے دولت کدہ پر ہونے والی ماہوار مقدس محفلوں کی رہین ہیں۔

میں جناب محترم پروفیسر حسنین کاظمی اور محترم پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی صاحب کا انتہائی ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی مصروفیات کے قیمتی لمحات میں سے چند ساعتیں ایسی بھی نکال لیں جن میں میرے لیے شفقت و محبت کا اظہار قلم بند کیا جا سکا۔

کتاب کی ترتیب و تدوین کے لیے میں اپنے دو احباب پروفیسر شاہ گورکھپوی اور معراج جامی کا بھی شکرگزار ہوں۔

حالات نے اجازت دی اور صحت نے نفس کی آمد و رشد کا سلسلہ کچھ اور عرصے تک جاری رکھا تو انشاء اللہ میرا زیرِ ترتیب تیسرا غزلیات پر مشتمل مجموعہ کلام ''روشنی جلتی ہوئی'' جلد ہی آپ کے پیشِ نظر ہوگا۔

''م'' صفحہ ۲۱

سفر کی شام ہوتی جا رہی ہے

یہ میرا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ پہلا غزلوں کا مجموعہ "آگہی سزا ہوئی" کے عنوان سے شائع تو ۱۹۹۳ء کے اوائل میں ہوا تھا لیکن دراصل وہ ترتیب وتدوین اور کتابت کے مراحل سے ۱۹۹۲ء میں ہی گزر چکا تھا کہ حتیٰ کہ "رنگ کی بات کر رہا ہوں" کے تحت میری اپنی تحریر بھی ۱۹۹۱ء کی ہی کتابت شدہ تھی یہ تفصیل میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ میری اس کتاب کی طباعت ایک سال تک تعطل کا شکار ہی جس کی واحد وجہ میری پیاری بیٹی ثمینہ (مرحومہ) کی شدید علالت تھی اور اس وقت میری بچی کا بہتر سے بہتر علاج ہی میری اوّلین ترجیح تھی اس کتاب کے بعد ۱۹۹۹ء میں میری دوسری کتاب جو صرف نعتوں پر مشتمل تھی، "م" ﷺ کے نام سے چھپی تھی لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر میں اپنے اس دکھ کی بھی کچھ تفصیل آپ کو سنا دوں جو میری زندگی کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔ بیٹی ثمینہ کی موت ایسی موت نہیں جسے زندگی کے کسی بھی لمحے میں بھول جاؤں یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں ہے مگر حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ اپنی حیثیت سے آگے بڑھ کر اس کے علاج کا انتظام اور روز و شب اُس کی تیمارداری (جس میں گھر کے تمام افراد شریک تھے) پھر مختلف وظیفوں پر مشتمل دعاؤں کا تسلسل بھی میری جواں سال، تعلیم یافتہ اور دانشمند بیٹی کو موت کے پنجے سے نہیں بچا سکا میں نے اپنی بیٹی کو کیسے کھویا وہ منظر دائمی طور پر میرے ذہن میں نقش ہو گیا۔

اُس سے کچھ دور اک موت ٹھہری ہوئی اُس کی آنکھوں میں اک خواب سہما
میں نے دیکھا مگر کچھ کر نہ پایا اور وہ فرشتہ اجل کا اُسے لے گیا

۲۰ راگست ۱۹۹۳ء (یکم ربیع الاوّل ۱۴۱۴ھ) کی شدید گرمی سے جھلسی ہوئی وہ دوپہر میں کیسے بھول سکوں گا جب اپنے والدین کی آغوش میں ہسپتال پہنچنے سے پہلے میری بچی صبر وتحمل

کا پیکر ہی دم توڑ گئی۔ بچی کیوں بروقت ہسپتال نہ پہنچ سکی یہ قصور میرا نہیں۔ ایم۔کیو۔ایم کی اُس پہیہ جام ہڑتال کا تھا جس کے سبب میرے پریشان بیٹے کو سڑک پر کوئی بھی ٹیکسی نہ ملی وقت تیزی سے بھاگا جا رہا تھا اور ثمینہ کی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسے میں میرے ہمدم ہمسائے اپنی فاکس ویگن لیے باہر نکلے اور سڑک پر جلتے ہوئے ٹائروں کے شعلوں سے بچتے بچاتے اپنی گاڑی دوڑانے لگے ایسے میں ایک ایک لمحہ گزراں صدیاں بن کر ہم پر مسلط ہو رہا تھا لیکن تقریباً آدھے گھنٹے بعد ضیاالدین ہسپتال پہنچے تو ساری دوڑ دھوپ رائیگاں گئی ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا حادثہ تھا کیسے بتاؤں کہ یہ چند سطریں بھی لکھتے ہوئے میرے آنسو رواں ہیں۔ سچ پوچھئے تو اپنی جان سے پیاری مرحومہ بیٹی کا یہ حادثۂ جانکاہ مجھے ریزہ ریزہ کر چکا تھا۔ خدا کسی کو اپنی جوان اولاد کا ایسا سانحہ نہ دکھائے میں جینے کی ہر امنگ سے محروم ہو چکا لیکن یہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے اُس میں موجود یہ "نسیاں" کی صفت بھی عجیب چیز ہے جو قدرت بطور مرہم آدمی سے استعمال کرواتی ہے مجھے بہر حال جینا تھا۔

حیات میرا مقدر تھی کیا کیا جائے

اس حقیقت کے باوصف کہ میری پہلی کتاب ثمینہ کی جواں مرگی کے بعد شائع ہوئی میں اپنی یہ بپتا اُس میں نہیں لکھ سکا جس کا سبب میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں لیکن "آگہی سزا ہوئی" اسی سال شائع کرنے کا اہتمام بھی میں نے مرحومہ کی آخری خواہش کے احترام میں ہی کیا تھا۔ کیونکہ وہ اکثر کہا کرتی تھی "پپا میرا علاج آپ بند کر دیجئے کیونکہ اب میں زندہ نہیں بچوں گی بس آپ اپنی کتاب لے آیئے" یہاں میں چند باتیں اور بھی میری شاعری کے قارئین کی معلومات کے عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ شاید اس کتاب کی اشاعت کے بعد سانسوں کی رفتار بھی دھیمی ہو جائے شاید چوتھا مجموعہ آتے آتے میری صحت جواب دے جائے ویسے بھی زندگی کا کیا بھروسہ۔

مسافت کی تھکن لادے ہوئے ہوں
سفر کی شام ہوتی جا رہی ہے

"آگہی سزا ہوئی" کی پذیرائی میری توقع سے بڑھ کر ہوئی تھی۔ اور اہلِ نقد و نظر نے جس طرح کھل کر میری شاعری کو سراہا وہ میرے لیے باعثِ اطمینان تو ہے مگر باعثِ تفخر نہیں۔ اس لیے بفضل تعالیٰ میں اُس جذبے سے بچا رہا جو انسان میں اپنی تعریف سننے کے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ عزت دینا خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے دے اور تکبر کرنے والے سے واپس بھی لے لے۔

اس کتاب "روشنی جلتی ہوئی" کے ابتدائی صفحات میں ایسی ہی چند منتخب آراء موجود ہیں۔ کتاب کی پشت پر البتہ میرے محترم بزرگ سید مسعود اعجاز بخاری (میرپور آزاد کشمیر)، و محسن ملیح آبادی کی اُن گراں قدر تحریروں کے اقتباسات ہیں جنہیں پڑھ کر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید خوشی سے پاگل ہو جاتا یا شاعری چھوڑ کر سنیاس لے لیتا۔

یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ محترم بخاری صاحب کو میری شاعری میں چھپا ہوا ایک آدمی اتنا پسند آیا کہ وہ میری شاعری اور شخصیت پر ایک مربوط اور جامع کتاب لکھنے کی زحمت کر رہے ہیں۔ انہوں نے خبر دی ہے کہ "روشنی جلتی ہوئی" کی اشاعت کے فوراً بعد وہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ اس تیسرے مجموعے کلام کی غزلوں، نظموں اور قطعات کی ترتیب و تدوین میں مَیں نے کسی بھی دوست یا کرم فرما سے کوئی مدد نہیں لی ہے یہ میرا اپنا انتخاب ہے اور اس سلسلے میں مَیں نے جس تخلیق کے بارے میں بھی یہ سمجھا کہ یہ میرے قاری کے پڑھنے کی چیز ہے اُسے کتاب میں شامل کر دیا۔ بہت ممکن ہے اس حوالے سے میری نظر کہیں بھٹک گئی ہو یا بہک گئی ہو تو اسے انسانی غلطی سمجھ کر درگزر کر دیجیے کیونکہ یہ مراحل اتنے دشوار تھے کہ شعور اور لاشعور کی اس جنگ کو میرے اعصاب زیادہ دیر تک برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اب بھی میری تحویل میں کم از کم پچاس قابلِ اشاعت غزلیں اور بیس نظمیں موجود ہیں جو "متفرق اشعار" کے صفحات پر آپ دیکھ سکیں گے۔

زندگی کے اس مرحلے پر جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو صرف چند خوشگوار یادوں کے

علاوہ ساری یادیں انتہائی بھیانک اور تلخ ترین واقعات سے بھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور کبھی کبھی مستقبل کی جانب بڑھتی ہوئی میری سبک روی کے آگے آسیب کا روپ دھار کر کھڑی بھی ہو جاتی ہیں ویسے تو خالق کائنات کی کرم نوازی سے میں رجائیت کے علاوہ اپنی شاعری میں کسی اور جذبے کو جگہ نہیں دیتا مگر تجربات اور مشاہدات کی اُن مکروہ صورتوں کا کیا کروں جنہوں نے آدمی کا سوانگ رچا کر راکششوں کا کردار ادا کیا۔ اپنی نورانی صورتوں کے نقاب کے اندر مکروہ چیزوں کو چھپا کر مجھ سے وشواش گھات (مجھے فوری طور پر اُردو میں اس ہندی لفظ کا وسیع المعانی متبادل نہیں مل سکا) کیا۔ بہر حال سارے ایسے کردار مجھ سے ٹکرائے لیکن یہاں میں ایک ایسے شاہ صاحب کا ذکر ضرور کروں گا جس کے نام سے ہی "نور" "علیٰ نور" کا تصور ابھرنے لگتا ہے یہ حضرت جب بھی مجھ سے ملتے دور ہی سے باہیں پسار کے ملتے اور دیر تک اپنی باہوں سے میری پسلیوں کو توڑنے کی حد تک جکڑتے اور پھر میٹھی میٹھی باتوں کا سحر ایسا پھیلاتے کہ میں مسحور ہو جاتا اور اگلی ملاقات کی تشنگی کا احساس لیے اُن سے جدا ہوتا' یہ اُن کی تصویر کا ایک رُخ ہے لیکن دوسرا رُخ جو بھیانک ہے اُس کی کوئی تھاہ نہیں بس شرط یہ ہے کہ ان کو ڈسنے کا کوئی موقع ہاتھ آنا چاہیے۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا میری پہلی کتاب جب ایک نسلِ آئندہ کے نمائندہ اور افسانہ نگار کہلانے والے وقت کے ہاتھوں بنے ہوئے ایک مدیر کے توسط سے اُس نورانی شخصیت کے پاس تبصرے کے لیے پہنچی تو نہ جانے کب کا ان میں پوشیدہ بغض باہر آیا اور قلم کی نوک سے متحرک ہوا۔ "آگہی سزا ہوئی" پوری کتاب پڑھ کے انہوں نے ایک ایسا منفی تبصرہ اُس مدیر کے ذریعہ اُن کے جریدے میں چھپوایا جسے پڑھ کر میں ہی نہیں میرے ساتھ بہت سے اہلِ علم و ادب بھی دیر تک ہنستے رہے۔ چلئے مدیر نے اپنے دل کا غبار نکالا اور شاہ صاحب نے اپنے دامن کی گرد جھاڑی' مگر سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے مدیر موصوف نے ایک ایسے شخص کو جو نہ تو شاعری کی ابجد سے واقف تھا اور نہ ہی تنقید کے بارے میں کچھ جانتا تھا اس شخص کو ایک بھرپور فکری شاعری کی کتاب تبصرے کے لیے کیوں دی گیا؟ اس سے مقصود اپنے جلے دل کی پھپھولے پھوڑنا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اُس جریدے کے اگلے شمارے کے لیے

جب ایک مخزن علم وادب کا میری کتاب پر تجزیاتی مضمون اُس مدیر کے پاس پہنچا تو انہوں نے یہ کہہ کر اُسے چھاپنے سے انکار کر دیا کہ اس شمارے میں جگہ نہیں ہے۔

یہ تو صرف ایک مثال ہے ورنہ میری مختصر زندگی میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جو ایسے خوشنما چہرے اور دیرینہ رفاقت کا بھرم رکھتے ہوئے قریب آئے اور کبھی چند ملاقاتوں میں کبھی چند سالوں بعد کبھی دہائیوں بعد اپنے مکروہ روپ میں عریاں ہوئے۔ اس تعلقاتِ عامہ کے نمائشی دور میں کیسے کیسے لسانی، علاقائی اور قبائلی گروپ تشکیل دیے جاتے ہیں، کس کس طرح چند اخبارات کے کچھ ساختہ صحافیوں کی دعوتیں کی جاتی ہیں، کس طرح بے بنیاد ادبی خبریں بنتی ہیں اور کس طرح نمایاں انداز میں شائع کی جاتی ہیں اگر ان سب حقیقتوں کا انکشاف ہوتا رہتا تو یہ ٹانگ پکڑ کر گھسیٹنے والے کیسے زندہ رہتے کیوں کوئی قابل اجمیری خون تھوکتے ہوئے ایڑیاں رگڑ کر مرجاتا کیوں کسی کی پشت پر خنجر زنی سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی آخر کون لکھے گا یہ ساری سچائیاں؟

ہاں میں اپنی یہ تفصیل لکھتے لکھتے ذرا جذباتی اس لیے بھی ہو گیا تھا کہ شاید کوئی دیانت دار صاحب نظر مجھ جیسے انسان کے اندر چھپے ہوئے اس شاعر کو تلاش کر سکے جسے غالب عرفان کہتے ہیں۔

آخر میں مَیں اپنے بچوں کا تذکرہ ضرور کروں گا کہ قدرت نے مجھے ۵ بچوں (ایک بیٹا اور چار بیٹیاں) سے نوازا لیکن میری تیسری بیٹی ثمینہ جلد ہی مجھ سے بچھڑ گئی میری باقی تینوں بیٹیاں بھی اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں سب سے بڑی بیٹی شہکار، پانچ بچوں کی ماں ہے اس کے دو بڑے بچے شہباز اور شہلا اسی سال میٹرک سائنس میں A1 گریڈ حاصل کر کے آدم جی اور سرسید گرلز کالج میں داخلہ لے چکے ہیں جبکہ چھوٹے شہواز، شہبانو اور شہزاد بھی زیر تعلیم ہیں۔ دوسری بیٹی شبینہ کے دو بچے شاہ رخ اور شریق بھی بالترتیب ساتویں اور دوسری جماعتوں میں زیر تعلیم ہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی نازلی بھی ماشاءاللہ اپنی دو بیٹیوں اُمنہ اور اُشنا کو ابتدائی تعلیم سے فیضیاب کرا رہی ہیں۔ صاحبزادے محمد عمر فاروق شریف جو MBA کرنے کے بعد بیٹری (BATTRY) بنانے والے ایک بین الاقوامی ادارے میں علاقہ جنوبی پاکستان کے ایریا منیجر کے عہدے پر فائز ہیں

خیر سے شادی شدہ ہی نہیں بلکہ ایک دو سالہ بچی آلفہ کے باپ بھی ہیں۔

مسبب الاسباب کا بہت کرم ہے کہ اُس نے صرف مجھے لائق اولاد ہی نہیں دی بلکہ سلیقہ شعار اور تربیت گاہ کا منصب رکھنے والی بیوی بھی عطا کی ہے۔

میری نجی زندگی کا دوسرا رُخ

سقوطِ مشرقی پاکستان کے حوالے سے

ناانصافی ہوگی اگر میں یہاں اپنے چند اُن احباب کا ذکر نہ کروں جن کے ساتھ سابقہ مشرقی پاکستان میں میرے صبر آزما دن گزرے تھے اور اپنی پہلی کتاب کے ابتدائیہ میں سہواً مجھ سے ان کا تذکرہ رہ گیا تھا۔ شہاب بھائی (رمنا سگریٹ) اس سلسلے کی پہلی شخصیت ہیں جن کے ساتھ حالی شہر (چاٹگام) کی محفلیں رونق افروز ہوا کرتی تھیں۔ ایک عرصے تک یہ Red Cross کے اُس حلقے کے صدر نشین بھی رہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان کی معاملہ فہمی اور کھری کھری سنانے کی عادت نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں نے بہت کچھ ان کے مشاہداتی علم سے حاصل کیا۔ وہاں کی محفلوں کا ذکر آ گیا ہے تو مجھے ان دو عظیم مشاعروں کا بھی ذکر کرنے دیجیے جو Red Cross کے تحت وہاں سے کوچ کرنے سے پہلے میرے اعزاز میں منعقد کیے گئے تھے۔ پہلا مشاعرہ ایک قریبی مضافاتی بستی فیروز شاہ کالونی میں ہوا تھا جس کا انتظام ڈاکٹر ولی صدیقی غازی پوری کی محبت اور کرم فرمائی کا نتیجہ تھا۔ ایک بہت بڑے ہجوم نے میری پذیرائی کی اور چند بزرگ و معتبر شعراء نے بھی مجھ پر اشعار کہے تھے۔ میں نے اس مشاعرے میں نظم ''جینا ہے تو پھر فکر کا انداز بدل دو'' پڑھی تھی۔ دوسرا مشاعرہ حالی شہر میں ہوا (جہاں میں مقیم تھا) اس الوداعی مشاعرے کو اگر میں اپنی زندگی کا ایک یادگار مشاعرہ کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ جان صاحب مرحوم کے نسبتی برادر نثار بھائی کی رہائش گاہ پر یہ الوداعی نشست جو میرے اعزاز میں منعقد کی گئی دراصل میرے محترم کاوش عمر کی مجھ پر شفقت کا خوبصورت اظہار تھا۔ شہر کے مشہور و معروف شعراء کے علاوہ مہاجر آبادیوں سے بھی سامعین کی ایک بڑی تعداد اس مشاعرے کے

حاضرین میں شامل تھی۔ ہال میں دیواروں پر میرے اور حضرت کاوش عمر کے منتخب اشعار طغروں کی صورت میں آویزاں تھے۔ مشاعرے کے شرکا کے لیے پُر تکلف طعام کا اہتمام تھا اور اس طرح تقریباً رات بھر مشاعرہ تو چلتا رہا لیکن درمیان میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا جب مشاعرہ گاہ میں جگہ نہ ملنے کے باعث لوگ کھڑکیوں میں بیٹھ کر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے رہے۔ اس موقع پر میں نے خصوصی طور پر لکھی گئی نظم "تعمیر کی تخریب سے جاری ہے ابھی جنگ" سنائی۔ انہی دو موقعوں پر یوں تو کئی اشعار اور قطعات میری تحسین میں پڑھے گئے لیکن میرے پاس صرف دو دوستوں کے نذرانے ہی یہاں نقل کرنے کے لیے باقی رہ گئے ہیں۔

کوئی یہاں ہے خوب تو کوئی ہے خوب تر
احباب میں ہمارے بڑا یہ کمال ہے
ان میں ہی ایک فرد ہیں غالب شریف بھی
کس کو نہیں جدائی کا ان کے ملال ہے

عطاء الرحمٰن فردوسی

(۱)

یہ زبیرؔ اخترؔ و سمیعؔ و مجیدؔ جن سے اس انجمن کی رونق ہے
ان پہ احباب ناز کرتے ہیں، تازہ ہیں جن سے ولولے دل کے
غالب شریف کی مہمانی اور انتظام ولیؔ جزاک اللہ
اور نظام احمد آف روپالی بینک مہتمم ہیں ہماری محفل کے

(۲)

منفرد دوستوں کی محفل میں
دوستوں کا خلوص لائے ہیں
دوستانہ وداع لینے کو
اہلِ فیروز شاہ آئے ہیں

(۳)

یاد آکر تری حسیں باتیں
لینے دیں گی کہاں کسی کو چین
درد سے بے قرار ہے کاوش
غم سے بے تاب ہیں غلام حسین

جمیل جاوید

اس کتاب کے اختتامی اوراق میں، میں نے اُس شاعری کا انتخاب بھی آپ کے سامنے رکھ دیا ہے جو وہاں سقوطِ مشرقی پاکستان کے دوران ایک خونچکاں زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرتے ہوئے مجھ پر نازل ہوئی تھی۔

یہ قطعات اور نظمیں جس تاریخی ترتیب سے اور جیسے کہے گئے اسی تاریخی ترتیب سے کتاب میں موجود ہیں۔ اس شاعری کو سامنے لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس میں آج سے تیس سال پہلے کے غالب عرفان کو آپ تلاش کرسکیں۔

اظہارِ تشکر

۱۔سب سے پہلے تو میں بارگاہِ الٰہی میں اپنا ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اپنا یہ تیسرا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر لانے کی توفیق عطا فرمائی۔

۲۔میں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے چند گراں قدر لمحے میری اس کتاب پر اپنی تحریر کے لیے صرف کیے۔

۳۔میں اپنے دوست معراج جامی صاحب کے خلوص کا بھی دو مختلف حوالوں سے شکر گزار ہوں، ان کا پہلا کرم تو یہ ہے کہ ممبئی میں تین سال قبل آنجہانی کالی داس گپتا رضا سے ملاقات کے دوران میری شاعری کو ان کے سامنے رکھا اور ان کی گرا قدر آراء حاصل کیں۔ ان کی دوسری نوازش یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے تمام مراحل میں ابتدا ہی سے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی سے مجھے فیض یاب کرتے رہے۔

غالب عرفان

(۵ نومبر ۲۰۰۲ء بمطابق ۲۹ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ) روشنی جلتی ہوئی ص ۲۲ تا ۲۹

ہوئی ہے نم دوبارہ میری مٹی
نئے سانچے میں ڈھلنا چاہتا ہوں

میرا چوتھا مجموعۂ کلام ''روشنی اور پرچھائیاں'' آپ کے ہاتھوں میں ہے جس کے لیے میں اپنے خالق کائنات کے حضور سربہ سجود ہوں کہ اس نے میری معذوری کے باوجود مجھے اس قابل بنایا کہ میں اس مجموعے کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اس سے قبل ''آگہی سزا ہوئی'' (۱۹۹۳ء) اور ''روشنی جلتی ہوئی'' (۲۰۰۳ء میں) منظر عام پر آ کر میری توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اور بیچ میں ''م'' صلی اللہ علیہ وسلم (نعتیہ مجموعے) کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ میرے پاس اپنے ریکارڈ کے لیے صرف ایک نسخہ بچ پایا۔

اس وقت جب آپ میری یہ کتاب پڑھ رہے ہیں میں ہنوز اپنے لنگ پن کے سبب کمرے میں مقید ہو کر صرف Walker کی مدد سے چل پھر رہا ہوں' نو ماہ سے زیادہ کا عرصہ میری صحت مندی میں لگنے کا سبب ذیابیطس اور دل کا عارضہ ہے جس میں پرہیزی غذا کی ترجیح نے طاقت بخش غذاؤں سے منہ پھیر رکھا ہے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میرے اس کارجنوں کے محرک خود میرے دوست خرم جلیل ہیں جن کے بار بار اصرار نے مجھ میں ایک نئی توانائی عطا کی کہ وہ خود اپنے مجموعۂ کلام ''کارجنوں'' کے خالق ہیں جو حال ہی میں منظر عام پر آ کر مقبولیت کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ موصوف نے اس کی تیاری میں جس طرح میرے ساتھ تعاون کیا ہے اس کے لیے میں ان کا احسان مند ہوں کہ صرف اظہار تشکر کے الفاظ اس تعاون کا مفہوم ادا نہیں کر سکتے۔ بس یوں سمجھیے ''حسابِ دوستاں دردل'' اللہ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔

کتاب کی تیاری میں کسی خاص اصول کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ گذشتہ نو سال سے میرے ذخیرے میں جو شاعری مختلف بکھرے ہوئے کاغذوں میں مل سکی انہیں بغیر انتخاب کے جیسے تیسے

پیش کر دیا گیا لیکن میرا یہ کلام بہر حال میرے خونِ جگر سے سینچا گیا کلام ہے۔ جس کے مطالعے کے بعد مجھے اہلِ نقد و نظر اور عام ادبی قاری کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

میں یہاں میرے محترم و مکرم نقاد و ادیب جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی کرم فرمائی کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں جن کی گراں قدر رائے ہی میرا تعارف ہے۔ ڈاکٹر جمال نقوی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے بلا تاخیر تقریظ لکھ کر میرے حوالے کر دی۔ میں جناب تشنہ بریلوی کا بھی اُن کی رائے کے لیے ممنون ہوں اور ملک کے مایہ ناز مصور محترم بشیر موجد کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ صرف میرے ایک خط پر ایک ہفتے کے اندر اپنے فن کا شہکار مجھے بھجوا دیا جو اس وقت سرورق پر زینت افروز ہے۔

حادثۂ جسم و دل

میری زندگی کا وہ منحوس ترین دن ۱۴ مئی ۲۰۱۱ء (بروزہ ہفتہ) بھلا میں کیسے بُھلا دوں جب دن کے ساڑھے گیارہ بجے ڈاک خانے جاتے ہوئے میری موٹر سائیکل گھر کے قریب بیچ سڑک میں پڑے ہوئے بلاک پر (میری بد احتیاطی سے) چڑھ گئی اور موٹر سائیکل بے قابو ہونے کے سبب میری داہنی ٹانگ کی گھٹنے کے نیچے کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ کر چُور چُور ہو گئیں اس کے بعد جو ہوا وہ ایک لمبی داستان ہے۔ جس کے نتیجے میں نو ماہ بیت جانے کے بعد بھی میں زخمی ٹانگ پر وزن نہیں رکھ سکتا۔ مختصراً یہ کہ میرے بھانجے رفیق شجاع (جو میرے بڑے داماد بھی ہیں) نے فوراً اپنے دونوں بیٹوں ڈاکٹر شہباز اور شاہ نواز کو روانہ کیا T.O کلینک میں فوراً آپریشن کیا گیا سرجن ڈاکٹر ساجد نے مسیحائی میں دیر نہ کی ورنہ خون اندر ہی اندر بہہ کر اتنا جمع ہو گیا تھا کہ پاؤں کو گھٹنے کے نیچے سے کاٹ دینا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہمیشہ خوش رکھے۔

کناڈا میں میرے بیٹے عمر فاروق کو ٹیلی فون پر اطلاع دی گئی وہ ہوا کی طرح اڑتا ہوا پہنچا اسی دوران مجھ پر دل کا دورہ پڑا پھر ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال میرے مرض کی تشخیص میں T.O کلینک، رب میڈیکل سینٹر، کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز اور آخر کار لیاقت نیشنل ہسپتال علاج کے لیے داخل کیا گیا اس سے قبل آغا خان ہسپتال میں ایک شب رہنے کے بعد انہوں نے

وہاں سے واپس کر دیا تھا۔ پاؤں میں پلاسٹر کے ساتھ مجھے لے کر میرے بیٹے نے جو دوڑ دھوپ کی اس سلسلے میں اس کے کتنے لاکھ روپے خرچ ہو گئے۔ اس کا آپ صرف اندازہ ہی کر سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ فی زمانہ باپ کا درد رکھنے والی ایسی اولاد بھی خال خال پائی جاتی ہے۔ اللہ اسے اپنے اہل وعیال کے ساتھ شاد و آباد رکھے۔

اس دوران رات کو ہسپتال میں میری خبر گیری کے لیے صاحبزادے کے علاوہ میرے چھوٹے داماد محمد علی، میرے نواسے شاہ رخ اور میری بیگم صبیحہ بیگم نے جس طرح میری خدمات انجام دی ہیں اُن کا ذکر کر کے میں ان کے احسانات کو شمار نہیں کر سکتا جو ان تمام نے میرے ساتھ کیے ہیں۔ پھر میرے دوست نجیب عمر کی وقتاً فوقتاً عیادت اور میرے دوسرے داماد پرویز احمد کی حوصلہ افزائی نے میری مایوسی کو کم کیا۔

تقریباً تین ہفتے تک ان ہسپتالوں کا چکر لگانے کے بعد میری بیگم نے ایک پلاسٹر میں مقید دل کے مریض کی جس طرح تیمارداری کی اُس کی مثال موجودہ دور میں، مَیں نے کسی بیوی میں نہیں دیکھی مجھے اللہ کی ذات سے یہ امید ہے کہ اس طرح انہوں نے اپنی عاقبت کا سودا کر لیا ہے اور میری دعا ہے کہ یہاں سے وہاں تک انہیں اس کا ثواب ملتا رہے۔

میرے بڑے نواسے جو خود بھی ڈاکٹر آف فارمیسی کر چکے ہیں۔ میرے جراحت شدہ پاؤں کی مرہم پٹی کرنے ہر دوسرے روز اپنے کام سے فارغ ہو کر رات کے گیارہ بجے چھ کلومیٹر کا سفر کر کے پہنچتے اور ڈریسنگ تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ تقریباً تین ماہ تک، جب تک پلاسٹر مکمل نہیں گیا ان کی یہ خدمات جاری رہیں، انہیں اس کارِ ثواب کا انعام انشاءاللہ ضرور ملے گا۔ یہی نہیں ہر ہفتے اپنی کار میں T.O کلینک لے جا کر ڈاکٹر ساجد سے معائنہ کروانے کی ذمہ داری بھی انہوں نے سنبھال رکھی تھی۔ اُن کی ان خدمات کو میں صرف خونی رشتے کی کشش نہیں بلکہ حد سے زیادہ اُن کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری انسانیت کا نام دوں گا۔

یوں تو میرے چھوٹے بھائی محمد لیسین شریف، میری تینوں بیٹیوں شہکار، شبینہ، نازلی اور ان

کے بچوں نے ہمیشہ ہفتہ عشرہ میں میرے گھر آ کر اور ٹیلی فون کے ذریعے میری خبر گیری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن میرے سب سے چھوٹے داماد محمد علی (نازلی کے شوہر) نے گھر کی ضروریات اور میری دواؤں کی فراہمی میں بیگم کی جس طرح مدد کی اور نا دستیاب دواؤں کی فراہمی کے لیے جس طرح بازاروں اور گلیوں کے چکر کاٹے وہ انہی کا حصہ تھا۔ روزانہ ٹیلی فون پر خیریت پوچھنے کے ساتھ ضروریات بھی پوچھ لیتے تھے۔

محمد علی کو میں نے اپنی زندگی میں واحد ایسا داماد پایا جو بیٹے کی طرح بڑھ چڑھ کر خسر کی تیمارداری میں پیش پیش رہے۔ اللہ انہیں اپنے اہل و عیال کے ساتھ خوش رکھے آمین۔

سابق وزیرِ اعظمِ ہند کی کرم فرمائی

بھارت کے سابق وزیرِ اعظم جناب اندر کمار گجرال جی جو حیدرآباد دکن میں ہندوستان کی پہلی اردو یونیورسٹی کے بانی اور تاحیات صدر ہیں ۲۰۰۶ء کے اواخر میں ہونے والی عالمی اردو کانفرنس کے صدارتی خطبے بعنوان "اردو رابطے کی زبان" کے آخر میں اپنی تقریر کا نچوڑ میرے ان دو اشعار میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

"ابھی تھوڑے دن پہلے پاکستان کے ایک شاعر غالب عرفان کے یہ اشعار دیکھے تھے:

میرے عکس اور مجھ میں کوئی جستجو ہے باقی
نہیں روکنا تکلم ابھی گفتگو ہے باقی

نہیں ناامید ہونا مری نسلِ شیشہ گر سے
کہ نگاہِ شیشہ گر میں ابھی کچھ لہو ہے باقی

یاد رہے کہ یہ سہ روزہ اردو کانفرنس وہاں بی بی سی کے اہتمام سے منعقد ہوئی تھی جسے ہندوستان کے سرکاری ٹی وی چینل نے ٹی۔وی پر پیش کیا تھا یہ تقریر جب مقتدرہ قومی زبان کے ماہنامہ "اخبار اردو" کے فروری ۲۰۰۷ء میں چھپی تو میرے گہرے دوست خیال آفاقی نے دوپہر کی

چلچلاتی دھوپ میں فیڈرل بی ایریا سے سفر کر کے مجھے گھر لا کر دکھایا۔ پھر میں نے ان سے (اندر کمار جی) سے رابطہ کر کے انہیں اپنا مجموعہ کلام "روشنی جلتی ہوئی" ارسال کیا تو انہوں نے مجھے فون کر کے میری عزت میں اضافہ کیا اور یہ خط جو کتاب کے آغاز میں مئیں نے شائع کیا ہے ارسال کیا تھا۔

اس مسرت کو "بزمِ شاعری" (میٹرو۔ون) کے ایک پروگرام میں (جب میں اشعار پڑھ رہا تھا) محی تشنہ بریلوی نے ہوا کے دوش پر یہ قطعہ پڑھ کر دو چند کیا:۔

عرفاں کے شیدائی تو ہیں حضرتِ گجرال
قطعہ جو پڑھا آپ کا تھا وجد میں پنڈال
یہ معجزۂ فن یہ ہُنر شیشہ گری کا
ہر شعر میں ہے رقص کناں آتشِ سیال

غالب عرفان

"روشنی اور پرچھائیاں" ص ۴۱ تا ۴۴

باب ۲

اصنافِ سخن اور تخلیقی وژن

غزل، نظم، آزاد نظم، فردیات، قطعات، حمد و نعت اور قومی و ملی نغمات ان کے اظہاراتی میدان ہیں۔ غالب عرفان اہلِ زبان ہیں۔ اہلِ زبان ہونے کی حیثیت سے انہیں اظہار و بیان میں خاصی آسانیاں اور سہولیات میسر ہیں۔ انہیں کسی بھی مضمون کے بیان میں کسی مشکل یا دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ان کا کلام برِ عظیم پاک بھارت کے اکثر علمی و ادبی اور سیاسی و سماجی اخبارات و رسائل اور جرائد میں غالباً سب سے زیادہ شائع ہوتا ہے۔

اب تک ان کی چار شعری کتب شائع ہو چکی ہیں "آگہی سزا ہوئی"۔ "روشنی جلتی ہوئی"۔ "م" (نعتیہ مجموعہ کلام) اور "روشنی اور پرچھائیاں" کتب وغیرہ پر ان کے تبصرے اور مضامین بھی رسائل و جرائد اور اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ شاعری میں وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی لکھتے ہیں۔

ان کا اظہاراتی وژن خاصا وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ قومی و ملی اور بین الاقوامی موضوعات کو انہوں نے بڑی خوبصورتی اور چابکدستی کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی قومی و ملی تخلیقات میں انفرادی و بالکل ذاتی حوالے سے وسیع اظہاراتی مناظر اور غیر معمولی مشاہداتی وژن کا احساس جلوہ گر ہوتا ہے۔ ایک مقام تو ایسا آتا ہے کہ دروں بینی و بیروں بینی کی دوئی کا احساس مٹ جاتا ہے:

میں ذہن و دل کے تصادم میں ٹوٹتا ہی گیا
شعورِ وقت سے ٹکرائی جو مری آواز
محبتوں کے لیے صرف ایک لمحۂ جاں
تو نفرتوں کے تصرف میں ساری عمر دراز

کچھ شکست و ریخت نے توڑا انا کے خول کو
کچھ حصارِ ذات کے اندر بدل کے رہ گیا

کبھی تو ماضی وحال کی تخصیص مٹ سی جاتی ہے:

تاریخ کے دوراہے پر تہذیب کے ہاتھوں
انسان کو اتنا کبھی ششدر نہیں دیکھا
آئینے نے چہرے کا سکوں دیکھا ہے لیکن
پیوست کوئی پشت میں خنجر نہیں دیکھا
تخریب سے تعمیر کی ہر جنگ میں عرفاںؔ
تدبیر نے تقدیر کو مُڑ کر نہیں دیکھا

اور

غول اپنی اُڑان کھو بیٹھا!!
اک پرندے کے چوٹ کھانے سے

یہ کیسا کربناک کیفیات کا حامل شعری اظہار ہے:

سانس بھی لیتے ہوئے دم گھٹ سا جاتا ہے مرا
کیا مخالف ہوگئی مجھ سے مرے گھر کی ہوا

ندرتِ اظہار میں کیا وسعت اور گہرائی ہے ملاحظہ کیجیے:

جس انتشار پہ حیرت زدہ ہے سرگوشی
نگاہِ وقت سے مخفی وہ بات کیا ہوگی
شکستہ عہد میں تعمیرِ ذات کیا ہوگی
حصارِ جبر سے راہِ نجات کیا ہوگی
ہے جب دماغ کا محور ہی کہکشاؤں میں
خود آگہی سے الگ کائنات کیا ہوگی

قومی وملی حوالے سے ان کا کلام دیکھیے اس میں کس قدر ہمہ گیری اور وسعت ہے:

قومی نغمہ

ہم ہیں پاکستان، ہم میں ہے نہاں اپنا وطن
فطرتِ خوددار کا ہے ترجماں اپنا وطن
سرفروشی سے بھری اک داستاں اپنا وطن
قائم دائم ہیں جس سے حرمتیں اپنا وطن
منفرد ہے شان و عظمت اپنے پاکستان کی

ہم شعورِ فکر و فن ہیں امتحاں در امتحاں
ہم اصولِ بندگی ہیں آسماں در آسماں
ہم ہیں تحریکِ زمانہ تا حدودِ لامکاں
ہم متاعِ الہدیٰ ہیں تا ابد قرآن کی
منفرد ہے شان و عظمت اپنے پاکستان کی

عظمتِ رفتہ کی اک تہذیب کا آئینہ دار
نظریاتی مملکِ واحد، تحفۂ پروردگار
اے وطن تجھ پر کریں ہم ہستیاں اپنی نثار
جس طرح قائد نے اپنی زندگی قربان کی
منفرد ہے شان و عظمت اپنے پاکستان کی

تیرا دہقان و جفاکش، قوم کی روح و رواں
سر بکف تیرا محافظ فوج کا ہر اک جواں
ظلمتیں دو نیم کرتا اک ہجومِ کہکشاں
کوئی چھیڑے تو بتادے قدر اپنی آن کی
منفرد ہے شان و عظمت اپنے پاکستان کی

آگہی کی جوت سے دُھلنے لگے ہیں دل کے داغ
عقل کو ملنے لگا ہے منزلِ جاں کا سراغ
راستہ دکھلا رہے ہیں قوم کے روشن دماغ
نُور برسانے لگی ہے روشنی عرفان کی
منفرد ہے شان و عظمت اپنے پاکستان کی

ملی نغمہ

کتنی صدیوں کے اجالوں سے ضیا بار ہیں ہم
کیسے افکار کی خوشبوؤں سے سرشار ہیں ہم
کن تواریخ سے ابھرے ہوئے کردار ہیں ہم
ایک آواز ہیں ہم...... وقت کی رفتار ہیں ہم

کہیں شبنم کی طرح سرد، کہیں شعلہ بجاں
کہیں دانش کدۂ علم کے ہم روح رواں
کہیں تہذیب کے خالق کہیں تاریخ کی جاں
زیب ہو سر کو جو اسلام کے دستار ہیں ہم

دل کے رنگوں سے سجادیتے ہیں ہم وقت کو جب
حسن اور عشق کی تفسیر بدل جاتی ہے تب
زندگی بنتی ہے اللہ کی رحمت کا سبب
دستِ قدرت سے تراشا ہوا شہکار ہیں ہم

اپنی گل رنگ زمیں اپنے وطن کی خاطر
اپنی مٹی سے نیا عہدِ وفا کرتے ہیں پھر
روحِ قائد کی قسم ہم پہ ہے سب کچھ ظاہر
تجھ پہ آنچ آئے تو ہر طرح سے تیار ہیں ہم

اے وطن تجھ کو سلامت نئی تصویرِ حیات
نیا انسان نئی نسل نئے وقت کی بات
ہیں تری نذر نئی صبح نیا دن نئی رات
کہ رہِ عشق میں عرفان کا پندار ہیں ہم

☆

باب ۳

ایک انقلابی مزاحمتی فنکار اور دانشور

غالب عرفان استحصال کارانہ طرز فکر و عمل کے شدید مخالف ہیں۔ ان کی تخلیقی کاوشیں ردعمل اور مزاحمت کا بڑا خوبصورت اظہار یہ ہیں۔ ردعمل سے تلخی جنم لیتی ہے۔ کبھی تو ردعمل محض تلخی تک پہنچ پاتا ہے۔ پھر احتجاج وقوع پذیر ہوتا ہے اور احتجاج جب فکر و شعور کی ہمراہی میں آگے بڑھتا ہے تو نظریہ بن جاتا ہے۔ پھر وہ ردعمل کی قوتیں نظریے کی ہمراہی میں مزاحمتی روپ دھار لیتی ہیں۔ جوش زبان و بیان کے تمام تر وسائل کے ہوتے ہوئے محض احتجاج کے شاعر بن سکے۔ غالب عرفان اپنے عہد کا خود ہی موجد ہے اور خود ہی خاتم۔ کیوں نہ ہو کیونکہ وہ ہفت آسمان پر مکیں اور برا جماں دو ہستیوں غالبؔ و اقبالؔ سے برابر فیضیاب ہوئے۔ تخلیق اور دانش و ادراک کی ساری قوتیں اور وسائل تخلیقیہ کے ساتھ اپنے جہاں کا مکیں ہے۔

اس طرح وہ نئی صوفیانہ تخلیقی شعری روایت کا غماز بن جاتا ہے۔ نہ وہ کسی کے مماثل ہے اور نہ کوئی اس سے ہمرنگ۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مجھے یہ خوشی اور طمانیت ہے کہ وہ اس عہد میں میرا دوست ہے۔ غالب عرفان کا کلام شدید مزاحمتی توانائیوں سے بھرپور ہے۔ اس کے یہاں مزاحمتی شاعری کے بہت نادر نمونے اس کی غزل میں بھی مل جائیں گے اور نظمیں بھی اس کے مزاحمتی عمل کا پتہ دیتی ہیں۔ آیئے ملاحظہ کیجیے

''فکر کا انداز بدل دو'' اور ''جنگ جاری رہے'' اس کی بہترین مثالیں ہیں:

فکر کا انداز بدل دو

بھڑکے ہوئے جذبات کو سختی سے کچل دو
مایوسی، تقدیر کو تدبیر عمل دو
افکار کو ایمان کا فرمان اٹل دو
جینا ہے تو پھر فکر کا انداز بدل دو

وہ ظلم جو تا حال مقدر نے کیا ہے
وہ قہر جو تاریخ کے چکر نے دیا ہے
وہ جرعہ تلخاب جو رگ رگ نے پیا ہے
زہراب ہے وہ بغض و عداوت کا اگل دو

یہ مصلحت وقت کی آنکھوں کا تصنع
کینوں سے بھرے دل کو محبت کی توقع
تحریص کے ملبوس کا دل کش یہ تنوع
تصدیق حقیقت کا قدم رکھ کے مسل دو

چادر یہ گناہوں کی مسک کر جو سلی ہے
یہ لب پہ ہنسی کتنا لہو پی کے کھلی ہے
یہ درد کی ہر سانس جو قسمت سے ملی ہے
اس ماتمی نوحے کو بھی اعجاز غزل دو

خوابوں سے بہت دور ہے دنیائے حقیقت
تخئیل کہاں اور کہاں عزم کی دولت
میدانِ عمل پہلے پھر ارمان کی جنت
جنت کی تمناؤں کو اب حُسنِ عمل دو

حالات کی بہتی ہوئی اس دھار کو دیکھو
ہر سر پہ لٹکتی ہوئی تلوار کو دیکھو
اس شورش و ہنگامۂ افکار کو دیکھو
اور وقت کے ہاتھوں میں وہی سازِ ازل دو

اب راکھ میں پوشیدہ شرارے جگا دو
آئینۂ ادراک کی سب گرد اڑا دو
انسان کو انسان کی پہچان بتا دو
اُلجھے ہوئے اذہان کو الجھاؤ کا حل دو

اسلاف کی تاریخ کے اوراق کو دیکھو
اوراق پہ بکھرے ہوئے اسباق کو دیکھو
مردانِ وفا پیشہ آفاق کو دیکھو
کردار کی عظمت کا نیا تاج محل دو

یہ غم، یہ غمِ دہر کے مارے ہوئے انساں
انسان کی نظروں سے اُتارے ہوئے انساں
حالات کی ہر جنگ میں ہارے ہوئے انساں
ان سب کو نیا ولولہ فکر و عمل دو
جینا ہے تو پھر فکر کا انداز بدل دو

☆☆☆

جنگ جاری ہے

آدابِ مروت کے بدلتے ہوئے یہ ڈھنگ
ہر شیشۂ حرمت پہ برستے ہوئے یہ سنگ
انسان کی تقدیر کا اُڑتا ہوا یہ رنگ
تعمیر کی تخریب سے جاری ہے ابھی جنگ

ہر قلب محبت کی یہ بکھری ہوئی قاشیں
چہرے پہ حقیقت کے، تصنع کی خراشیں
تہذیب و تمدن کی تعفن زدہ لاشیں
انسان خود انسان کے بہروپ پہ ہے دنگ

اغراض کے سانچوں میں یہ ڈھلتا ہوا انساں
یہ حرص کے شعلوں میں پگھلتا ہوا انساں
یہ گرتا ہوا گر کے سنبھلتا ہوا انساں
بیداریِ احساس کا خوابیدہ سا آہنگ

یہ گرتی ہوئی کہنہ روایات کی دیوار
ٹوٹی ہوئی زنجیرِ قدامت کی یہ جھنکار
مانا کہ بہت دور نہیں صبح کے آثار
اوہام میں غلطاں ہیں مگر دانشِ فرہنگ
خورشیدِ ترقی پہ یہ چھائی ہوئی بدلی
شیرینیِ الفاظ میں لپٹی ہوئی تلخی
بازارِ سیاست کی یہ بڑھتی ہوئی گرمی
جکڑی ہوئی پھر اس پہ تعصب کی قبا تنگ
یہ حادثۂ وقت کا انعامِ جفا خیز!
مشرق کو دبوچے ہوئے یہ پنجۂ خوں ریز
پیراہنِ جمہور میں پروردۂ چنگیز
پیراہنِ جمہور شفق تاب لہو رنگ
یہ عشوۂ تخئیل کے بہکائے ہوئے لوگ
خود کردہ گناہوں کی سزا پائے ہوئے لوگ
اور بھول پہ خود اپنی ہی شرمائے ہوئے لوگ
بڑھتے ہیں بجاتے ہوئے پھر عزم کا مردنگ
یہ جنگ جو ہر سمت ہر اک موڑ کھڑی ہے
یہ جنگ جو ہر دور کے انساں نے لڑی ہے
زنجیرِ تمدن کی بھی انمول کڑی ہے
اس حلقۂ زنجیر کی آواز ہے نیرنگ
اس جنگ میں گزرے ہوئے ادوار کی بو ہے
اس جنگ میں بیباکیِ کردار کی خو ہے
یہ جنگ کہاں، چاکِ تمنا کا رفو ہے
ہر معرکۂ زیست سے اس کا ہے جدا رنگ

اس جنگ سے تقدیر کی تحریر سنوارو
اس جنگ سے تہذیب کی تصویر نکھارو
اس جنگ سے یکجہتی ملت کو ابھارو
ہر نقش ہو پھر مظہر فن کاریٔ ارژنگ
تعمیر کی تخریب سے جاری ہے ابھی جنگ

۲۱ر جولائی ۱۹۷۳ء

باب ۴

لفظیات، تراکیب، بندشوں، تلمیحات اور تشبیہات واستعارات کا استعمال

غالب عرفان کے غیر معمولی تخلیقی وژن نے جب اظہار کی صورت اختیار کی تو زبان کا استعمال روایتی ہرگز نہیں بلکہ ان کے ہاں لسانی استعمالاتی تازہ کاری کا متاثر کن اور خوشگوار احساس جلوہ گر ہوتا ہے۔ بندشوں، تلمیحات اور تشبیہات واستعارات کا استعمال انہیں لسانی خدمات کا امین بھی بنا دیتا ہے۔ ان کی تخلیقی کاوشیں نئی فطری اور لسانی تشکیلات کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

طلب کی راہ کا عرفان تیری ہی بخشش
بسا ہے دل میں جو اُس آستاں کا مالک تُو

☆

حدودِ شہرِ عرفاں میں ابھی تک
سبب خُود ہی مسبب ہو رہا ہے

☆

لمسِ عرفاں کے سفر میں فاصلوں کے درمیاں
مجھ کو اپنی ماورا بینائیوں کا خوف ہے

☆

اسی کی کھوج میں عرفاںؔ زندگی ہے ابھی
جو اپنی فکر کا شہکار چھوڑ آیا ہے

☆

گرفتِ چشمِ عرفاں میں ہے منظر
اگرچہ کچھ نہیں ہے دسترس میں

راہِ عرفاں کے سفر کے دائرے
خواہشوں کے زیرِ محور آ گئے

☆

سمندر تو بھنور سے کھیلتا ہی رہتا ہے لیکن
نظر نے بحرِ عرفاں میں نیا گرداب دیکھا ہے

☆

اک شجر عرفان کا پھیلا تو تھا
شاخ کوئی بھی نہ تھی پھلتی ہوئی

☆

دشتِ امکاں سے شہرِ عرفاں تک
آنکھ تھی دستِ احتیاج نہ تھا

☆

سکونِ شہرِ عرفاں کو صدا دو
جہاں محراب و منبر بولتے ہیں

☆

دور سے لگتی ہے جیسی شہرِ عرفاں کی فصیل
چاہیے ویسا ہی کتبہ فن کے مدفن کے لیے

☆

نمازِ چشمِ عرفاں سے عیاں ہے
وصالِ ناگہاں اک باوضو کا

☆

عرفانِ کائنات کو ہے فاصلوں سے عشق
تجھ کو مگر وصالِ مکمل کی جستجو

آفتابِ فکر اک محور بدل کر رہ گیا
روشنی کے شہر کا منظر بدل کر رہ گیا

☆

تیری نگاہِ خواب کے عرفان کے لیے
میرا وہ شوقِ سیر و سفر پھیلتا رہا

☆

تیرے دل کی کتاب پڑھنے کو
صفحۂ رُخ پہ چشمِ تر ہے بہت

☆

آگہی کی تلاش میں عرفاںؔ
شہرِ امید کا سفر ہے بہت

☆

لمحۂ موجود سے معدوم تک
بٹ گیا ہوں وقت کے عرفان میں

☆

جراحتِ شبِ ہجراں بدستِ صبحِ وصال
مرے زمانے میں اُس کی کہیں نظیر تو ہے

☆

تہذیب کے کاندھوں پہ تقدس کا جنازہ
اخلاص نے اوڑھا ہے کفن یاد رہے گا

☆

مرے سر پہ ہے روشن ماہِ عرفاں!
اور اُس کی مانگ تاروں سے بھری ہے

راہِ عرفاں کا مسافر بھی کبھی
شرحِ حرف و صوت پر مامور تھا

☆

تلاشِ شہرِ عرفاں کے سفر میں
محبت کا پیمبر بولتا ہے

☆

کوئی حقیر سا ذرّہ ہو یا کوئی سورج
برنگِ کعبہ ہر اک سلسلہ طواف میں ہے

☆

حروفِ ربطِ تکلّم سے خوف کھاتے ہیں
نکل نہ جائے کہیں ساری جان لفظوں کی

☆

جہانِ شعر میں عرفانِ زندگی کے لیے
متاعِ فکر اُگلتی ہے کان لفظوں کی

☆

باب ۵

قومی تشخص کا احساس

سانحہ مشرقی پاکستان نے ہمیں ایسا زخم دیا جو کبھی مندمل نہ ہو سکے گا۔1947ء،1965ء اور 1971ء کی جنگیں ہماری بقا و سلامتی کی جنگیں تھیں۔1971ء میں تو ہماری بقا اور ہمارے وجود کو غیر معمولی خطرات لاحق ہو گئے تھے۔شدت سے ہمیں اپنے قومی وجود کی بقا اور سلامتی و تحفظ کے احساس نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔تمام لکھنے والے اس سے شدید متاثر ہوئے۔ان میں اپنے وجود اور بقا و سلامتی کا احساس شدید تر ردِ عمل کی صورت میں مختلف انداز اور اسلوب میں ہوا۔ادباء و شعراء اور دانشوروں نے تخلیقی اظہار کی صورت میں اپنے قومی تشخص کا اظہار کیا۔

غالب عرفان بھی تخلیق کاروں کی جمعیت کے ایک اہم فرد ہیں۔سانحہ مشرقی پاکستان میں ابتلا و آزمائش کی گھڑی میں جو قیامت ٹوٹی اس میں وہ بھی متاثر ہوئے۔بقا کی اس جنگ میں انہوں نے اپنا چھوٹا بھائی قربان کر دیا۔ان کی غزل و نظم ہر تخلیقی اظہاریہ پر اس واقعہ کی گہری چھاپ ہے۔وہ ایک بیحد محبِ وطن اور انسان دوست شخصیت ہیں:

<u>ہماری پہچان مٹ رہی ہے</u>

(نظم صفحہ 119 پر درج ہے)

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پیش منظر اور پس منظر کے تناظر میں

(تاریخی ترتیب سے)

کس قدر تیز ہوا چلتی رہی ہے کل رات
پتے پتے کا درختوں سے تعلق ٹوٹا
سبز ملبوس حوادث نے اُتارے ایسے
صبح کی جوت نے ہر پیڑ کو عریاں دیکھا

☆

انسانی ڈھانچے

(۱۰_۶_۱۹۷۲ء)

نکالے ہیں جو تم نے کھود کر آج
زمیں سے نو عدد انسانی ڈھانچے
کہاں پیدا ہوئے کیا قومیت ہے
زباں سے کچھ نہیں کہتے یہ سانچے
بلا تحقیق پھر کیوں مشتعل ہو
نہ مارو عقل کے منہ پر طمانچے

تازہ رواج

(۱۹_۶_۱۹۷۲ء)

پنجے میں اہلِ جور کے بے قیدِ پیرہن
حیرت سے اک اسیر جواں سال دیکھیے
اس نوجواں کے جسم پہ اک تار تک نہیں
تازہ رواج خطۂ بنگال دیکھیے
مرنے کے بعد بھی تو کفن اوڑھتا ہے جسم
زندوں پہ حدِ شرم کا یہ حال دیکھیے

کیوں روئے

(۲۵_۷_۱۹۷۲ء)

ہمارے حال کو ماضی سے کچھ نسبت تو ہے ورنہ
ہمارے عہدِ ماضی پر ہمارا حال کیوں روئے
سبب تاریخ سے پوچھا تو فوراً یہ جواب آیا
دیارِ قرطبہ میں حضرت اقبال کیوں روئے

☆

ٹوٹی چوڑیاں

(۲۷-۱۱-۱۹۷۲ء)

کھنکتی چوڑیوں کے ساز پر میں نے کئی نغمے
سنائے تھے کبھی معراج آدم کے تصور میں
مگر جب آج ٹوٹی چوڑیاں دیکھیں سرِ مقتل
حقیقت چیخ اٹھی مذبوح مریم کے تصور میں

تین دسمبر ۱۹۷۲ء

دلوں کے بغض کو حالات دھو رہے تھے ابھی
ابھی خلوص کی دیوی نے لی تھی انگڑائی
ابھی حیات کا ماحول بننے والا تھا
کسی نے تین دسمبر کو آگ بھڑکائی

خون کا سفر

(۱۷-۱۲-۱۹۷۲ء)

خون قطروں میں ٹپکتا ہے مگر یہ قطرے
جم کے اک ظلم کا آئینہ بنا دیتے ہیں
خون کی دھار بھی رکتی ہے وہیں پر جا کر
جہاں افکار بغاوت کو جلا دیتے ہیں

نقوش

(۲-۱-۱۹۷۳ء)

سالِ رفتہ کے نقوش جاوداں تو دیکھیے
ہر تصور کو نظر نے چاک داماں کردیا
تہہ بہ تہہ' پردہ بہ پردہ ، زندگی در زندگی
صیرفیِ وقت نے سب کچھ نمایاں کردیا

ایک طویل نظم ''دستاویز'' کا ایک بند

(۲۲۔۱۔۱۹۷۳ء)

ربع صدی کی یہ تاریخ کیوں ہوئی غمناک
کہاں پہ ذہن نے کھویا تھا فہم اور ادراک
اڑی بہار گلستاں کی یوں خس و خاشاک
کریدو راکھ تو پاؤ گے اک شرر تہہ خاک
شرر بجھا کے رہے گی ہماری چشم نم
لہو نچوڑ کے روشن کریں گے مشعل ہم

تمہارے نغمے

(۱۶۔۲۔۱۹۷۳ء)

تمہارے نغمے ابھی تشنۂ محبت ہیں
انہیں تو چاہیے سوز و گداز کے کچھ ساز
صدا کی گونج تو نغمہ نہیں ہوا کرتی
اصولِ نغمہ ازل سے ہے ساز اور آواز

خواب اور حقیقت

(۱۲۔۳۔۱۹۷۳ء)

کیوں تعاقب کر رہا ہے تو خیال و خواب کا
خواب کی دنیا نشیلی دھند ہے اور کچھ نہیں
دھند چھٹ جائے ذرا پھر دیکھ اپنے آس پاس
یہ زمیں یہ لوگ ہیں تیری بہاروں کے امیں

☆

شکاری

(۱۲۔۵۔۱۹۷۳ء)

کر رہی ہے زندگی تعمیر پھر اک قوم کی
نیو کہنہ ہے مگر اینٹیں نئی گارے نئے
دعوئ جمہور سن کر جانے کیوں دل نے کہا
جانے پہچانے شکاری لائے ہیں پھندے نئے

☆

ایقانِ حیات

(۱۰۔۶۔۱۹۷۳ء)

زیست کا یہ موڑ اک ماحول وحشت ہی سہی
حوصلوں کی روشنی پر سایۂ اوہام کیوں
وہم کے اس موڑ سے آگے ہے ایقانِ حیات
صبح سے پہلے ہی چہروں پر تھکن کی شام کیوں

باب ۶

نمائندہ غزلیں

سلسلہ ٹوٹے ہوئے پندار کا
حادثہ ہے کانچ کی دیوار کا

ٹوٹ کر بکھرا تو اندازہ ہوا
اک شکستہ عہد کی رفتار کا

میں نئی تاریخ پر اک عکس ہوں
گمشدہ تہذیب کے آثار کا

دیکھنا ہے اس حصارِ ذات سے
سارا منظر ذات کے اُس پار کا

منظروں میں ساری صدیاں عشق کی
دسترس میں ایک لمحہ پیار کا

سوچتا ہوں حرف کی سچائی سے
کیا رشتہ ہے صلیب و دار کا

چشمِ عرفاں سے الجھ کر رہ گیا
مسئلہ تہذیب کی اقدار کا

☆

جھوٹ پالتا رہا سچ کی بین کے لیے
سانپ بھی تو چاہیے آستین کے لیے

جرم کے نزول سے عدل کے حصول تک
اک ثبوت بھی نہیں منصفین کے لیے

زندگی کی رونقیں جہل نے یوں سمیٹ لیں
آگہی سزا ہوئی ہر ذہین کے لیے

وقت کا سفر اُدھر حاصلِ نظر اِدھر
دیکھنا محال تھا ناقدین کے لیے

وہم کا شعور سے ربط ہو تو ہو مگر
دل کا ہر معاملہ ہے یقین کے لیے

اک ستارۂ شمال رات کی بساط پر
ایک صبح کی دلیل دور بین کے لیے

☆

زندگی صرفِ نظر ہے دائرہ در دائرہ
یا مسلسل اک سفر ہے دائرہ در دائرہ

میں بھی اپنی ذات میں ہوں تہہ بہ تہہ اک کائنات
وہ خلاؤں میں اگر ہے دائرہ در دائرہ

آئینہ در آئینہ عکاس اک صورت کا عکس
مظہرِ شام و سحر ہے دائرہ در دائرہ

مجھ کو اس کے پاس لے جاتا ہے جو وہ راستہ
ایک ہی خط ہے مگر ہے دائرہ در دائرہ

وقت کے ہاتھوں میں ہے زنبیل جس کے نام کی
فاصلہ اُس کی خبر ہے دائرہ در دائرہ

جھوٹ کے کوہِ گراں پر مصلحت کی دُھند میں
اک سچ سینہ سپر ہے دائرہ در دائرہ

رنگِ عرفاں کو سمیٹے جسم و جاں کی رُت لیے
اِک دھنک آئینہ گر ہے دائرہ در دائرہ

☆

شعور ذات ابھی راہِ انحراف میں ہے
کہیں تو صاف کہیں دھند کے غلاف میں ہے

فضا کی لے پہ سمندر کا رقص کیا معنی
شکستِ موج ہواؤں کے اعتراف میں ہے

سکوتِ شب ہے کہ گویائی کھوگئی دن کی
یہ راز میری ابھی مشتِ انکشاف میں ہے

وہی ہے سارے فسانے کی منزلِ معراج
وہ ان کہی جو عبادت کے اک شگاف میں ہے

جو انتقام و عداوت کی تیرگی دھو دے
وہ سیلِ نور کسی چہرۂ معاف میں ہے

کوئی حقیر سا ذرہ ہو یا کوئی سورج
برنگِ کعبہ ہر اک سلسلہ طواف میں ہے

عجیب چیز ہے ہم رنگئی مزاجِ عرفاں
جو دل سے دور ہے وہ ذہن کے مضاف میں ہے

☆

پہلے نقطہ پھر خط لا انتہا بنتا گیا
رفتہ رفتہ رابطے کا سلسلہ بنتا گیا

میری صورت آئینہ خانے سے نامانوس تھی
آئینہ در آئینہ چہرہ نیا بنتا گیا

فاصلہ سمٹا تو قربت پر عیاں جو کچھ ہوا
وہ مری فکر و نظر کا زاویہ بنتا گیا

میں مسیحا تھا نہ کوئی پھر بھی میرے خون پر
ہاتھ پھیلے اور میں حرفِ دعا بنتا گیا

رنگ سی خوشبو ہوا میں منتشر ہوتی گئی
درد مہکا اور کرب ماورا بنتا گیا

روشنی، سایہ، سفر، تنہائیاں اور حوصلے
دشتِ عرفانِ خودی میں راستہ بنتا گیا

☆

وہ میرا عکس ہے یا اک گماں کسے معلوم
ٹھہر گیا ہے کوئی درمیاں کسے معلوم

ہوں اک وجود کہ خوابِ رواں کسے معلوم
سفر میں مَیں ہوں کہ نظمِ جہاں کسے معلوم

خیال پہلے تھا یا میں خیال سے پہلے
شعور و فکر کی یہ داستاں کسے معلوم

سفر میں شام و سحر تیری یاد ہے لیکن
نظر میں تو ہے کہ نفسِ تپاں کسے معلوم

فضا میں گونج رہی ہے جو اک صدائے جرس
اُسے سنے گا کوئی کب کہاں کسے معلوم

بلندیوں سے بہت دور شہرِ عرفاں میں
جو روشنی ہے پسِ آسماں کسے معلوم

☆

چل پڑا ہے جب سفینہ دھار پر
بجھ گئی ہے روشنی مینار پر

وادیٔ مغرب میں سورج خونچکاں
عکس اس کا مشرقی دیوار پر

چہرہ چہرہ آرزوؤں کی تھکن!
تیز تیشہ رکھ گئی پندار پر

کٹ گیا ہے روشنی کا دائرہ
تیرگی ہے ذہن کے پرکار پر

رہبرِ منزل ہے سوئے ارتقاء
آگہی کی روشنی کردار پر

ٹوٹ کر بکھرے انا کے سوگ میں
مصلحت آمیز اک انکار پر

قدر خونِ دل کی عرفاںؔ دیکھیے
چند سکے فن کے اک شہکار پر

☆

صحرا صحرا ایک ہی سراب دیکھتا رہا
میں خود اپنی فکر کا عذاب دیکھتا رہا

میں جہاں پہ ڈوبتا رہا وہیں پہ اک پرند
منظر طلوع آفتاب دیکھتا رہا

میں نہ آئینے کو پڑھ سکا مگر مرا وہ عکس
میرے چہرے پر لکھی کتاب دیکھتا رہا

مدتوں کے بعد اس سے مل کے اک سوال پر
میں اسے سراپا لاجواب دیکھتا رہا

گھر کے صحن میں اُمڈتا سیل روکنے سے قبل
میں رواں ندی کی سطح آب دیکھتا رہا

دسترس میں جو تھا اس کی قدر کھو چکا تو میں
جو نہ ہو سکا تھا دستیاب دیکھتا رہا

مجھ کو تک رہا تھا اک صحیفہ اپنے طاق سے
میں جدید نسل کا نصاب دیکھتا رہا

☆

جذبات کو دلیل سے سمجھا رہا ہوں میں
زنجیر موج موج کو پہنا رہا ہوں میں

اپنا نہیں سکا مجھے کوئی معاشرہ
گنجان بستیوں میں اکیلا رہا ہوں میں

جھونکا ہوا کا دھول نگاہوں میں بھر گیا
دروازہ کھولنے کا صلہ پا رہا ہوں میں

دامن یقیں کا چھوٹ گیا شہر خوف میں
وہموں سے رابطوں کی سزا پا رہا ہوں میں

تہذیب کے بہاؤ پہ چھوڑی ہے زندگی
تاریخ کے اصول کو اپنا رہا ہوں میں

عرفانؔ رنگ و بو کے لیے جسم و جاں کے ساتھ
خوشبوئے دل کو ذہن میں مہکا رہا ہوں میں

☆

اس کو معلوم ہے لوگوں کی نظر میں رہنا
جس نے سیکھا ہے ہواؤں کے اثر میں رہنا

فاصلے وقت کی دہلیز پہ سر رکھ دیں گے
زندگی جان تو لے سیر و سفر میں رہنا

کتنا آسان ہے تشہیر کی رو میں بہنا
کتنا مشکل ہے مگر موجِ ظفر میں رہنا

جن کے ہاتھوں میں ہیں پتھر وہ بھلا کیا جانیں
کیسے پھلتا ہے ثمر کیا ہے شجر میں رہنا

ان کو خوابوں کے جزیرے بھی نہ پہچانیں گے
جن کو منظور ہو یادوں کے بھنور میں رہنا

دیکھنا ہو جو مسافت کے مراحل عرفاںؔ
آئینہ بن کے ہر اک راہ گزر میں رہنا

☆

روشنی کھو گئی ہے منظر سے
آگہی ہٹ رہی ہے محور سے

ذہن و دل کے تحفظات لیے
زندگی ٹوٹتی ہے اندر سے

جانے کیسے ہوا نے رخ بدلا
آئینہ بچ گیا ہے پتھر سے

روز و شب صرفِ روزگار ہوئے
کوئی رشتہ نہیں رہا گھر سے

آرزو کو تلاش مستقبل
حال ماضی کی دید کو ترسے

ساحلوں کا مزاج پوچھے گی
لہر اٹھے تو دو سمندر سے

گفتگو کی تو ٹوٹ کے بکھرا
وہ جو سالم لگا تھا باہر سے

☆

رگِ شعور کا الجھا سرا نہیں ملتا
مرے وجود کا کچھ سلسلہ نہیں ملتا

میں آئینے کے مقابل ہوں اپنے پیروں پر
مگر یہ کیا ہے کہ چہرا مرا نہیں ملتا

خدا کی کھوج میں نکلو تو زندگی ناراض
جو زندگی کو مناؤ ' خدا نہیں ملتا

میں ذہن و دل کے تصادم میں ٹوٹ جاتا ہوں
عمل سے فکر کا جب رابطہ نہیں ملتا

صدا نہ دو کہ یہ دیوار و در کا جنگل ہے
یہاں کسی کو کوئی ہمنوا نہیں ملتا

سکھا رہا ہوں دھڑکنا میں پتھروں کو مگر
یہ جانتا ہوں کہ اس کا صلہ نہیں ملتا

لگن کی بات ہے عرفان گھر سے نکلو تو
تلاش کرنے پہ کس کا پتہ نہیں ملتا

☆

تاریخ کو جو شہر بسا کر دیے گئے
تہذیب کی صفات مٹا کر دیے گئے

مطلوب ہوگیا جو کبھی حق خوں بہا
ہم ہی بطور قرض ادا کردیے گئے

جن پتھروں کو ہم نے ہٹایا تھا راہ سے
ہر میل پہ وہ راہنما کردیے گئے

موسم کی آندھیوں میں گرفتار ہوگئے
طائرِ قفس کے جونہی رہا کردیے گئے

طاقت جنہیں ملی وہ تدبّر نہ پاسکے
بے دست و پا کو ذہن عطا کردیے گئے

ٹھہرے تو کارواں سے بچھڑتے چلے گئے
بولے تو قافلے سے جدا کردیے گئے

سمٹے تو تیرگی کا بھی عرفاں نہ ہوسکا
پھیلے تو روشنی کی ردا کر دیے گئے

☆

پھر عہد رفتہ مکرّر مری تلاش میں ہے
جو کھو گیا ہے وہ منظر مری تلاش میں ہے

بچھڑ گیا تھا جو مجھ سے انا کی راہوں میں
وہی سفر مرے اندر مری تلاش میں ہے

جدید ذہن کا آئینہ میرے ہاتھوں میں
قدیم دور کا پتھر مری تلاش میں ہے

حصارِ نیم شبی سے نکل رہا ہوں میں
طلوعِ صبح کا منظر مری تلاش میں ہے

بکھر گیا ہوں میں ساحل پہ ریت کی صورت
مشاہدے کا سمندر مری تلاش میں ہے

میں جب سے شہرِ تضادات کے سفر میں ہوں
مرے اصول کا جوہر مری تلاش میں ہے

پیامِ نو جو زمانے کو دے سکے عرفاںؔ
اس انقلاب کا محور مری تلاش میں ہے

☆

لہو کی دھار سے پرکھا گیا ہے
یہ سر تلوار سے پرکھا گیا ہے

کسی شیشے کے گھر میں بند کر کے
مجھے دیوار سے پرکھا گیا ہے

دریدہ پیرہن وہ شخص جس کا
نسب کردار سے پرکھا گیا ہے

ندی کی طرح بہتی زندگی کو
کھڑی پتوار سے پرکھا گیا ہے

تمہارے حسن کا معیار اکثر
مری گفتار سے پرکھا گیا ہے

وہ میرا عزم ہے کہ حوصلہ جو
صلیب و دار سے پرکھا گیا ہے

زمین پر بسنے والوں کو بھی عرفاںؔ
افق کے پار سے پرکھا گیا ہے

☆

خوشبوؤں کے شہر کا صرف رنگ رہ گیا
خانقاہ مٹ گئی اور ملنگ رہ گیا

کوئی بھی نہ بچ سکا جشن فتح کے لیے
شہر کی فصیل پر طبلِ جنگ رہ گیا

جان تو نکل گئی جسم کے حصار سے
درد کی صلیب پر انگ انگ رہ گیا

کس قدر کثیف ہے دھند آفتاب میں
روشنی کا دائرہ کتنا تنگ رہ گیا

لہر لہر آب کی آگ جب لگا گئی
سُر ہوا میں مل گئے جلترنگ رہ گیا

زندگی کی روشنی اس کی ہم سفر ہوئی
روز و شب کا تجربہ جس کے سنگ رہ گیا

گرہی کے حوصلے ہر قدم جوان تھے
آگہی کا راستہ بے اُمنگ رہ گیا

☆

یہ زندگی ہے یہاں یقیں کے سفر میں تھوڑا گمان بھی ہے
شعور فکر و نظر سے پہلے دلوں کا کچھ امتحان بھی ہے

سکوتِ شب کی سیاہ لہروں میں ایک وحشت چھپی ہے لیکن
ہوا کی سرگوشیوں میں پنہاں نئی سحر کی اذان بھی ہے

میں اپنی منزل کی جستجو میں جہاں سے گزرا ہوں دیکھتا ہوں
حصار ہمزاد کے علاوہ کوئی مرے درمیان بھی ہے

حصولِ تعبیر خواب کو جب حصار ٹوٹے گا ل دیکھ لینا
فقط کفن ہی نہیں ہے سر پر کہ اس ہتھیلی پہ جان بھی ہے

ازل کی روشن سحر نے بخشی جو دھوپ تحریک زندگی کو
ابد کی سرحد کے فاصلوں تک وہ روشنی سائبان بھی ہے

رکا ہے طوفان اور ملاح مطمئن ہو کے تیز رو ہے
مگر مری چشمِ دور بیں میں چھپی ہوئی اک چٹان بھی ہے

ہر ایک رُخ کی مسافتوں میں ہے جلوہ عرفان و آگہی کا
شعور انسان کی دسترس میں زمین ہی کیا آسمان بھی ہے

☆

میں صحرا میں سمندر دیکھتا ہوں
کبھی جو اپنے اندر دیکھتا ہوں

خود اپنے آپ کو پانے سے پہلے
میں گمشدگی کا منظر دیکھتا ہوں

سلجھ جاتی ہیں راہیں پیچ و خم کی
جو میں خود سے الجھ کر دیکھتا ہوں

ہے میری دسترس میں تو بھی لیکن
ہتھیلی میں مقدر دیکھتا ہوں

کبھی میں ڈوبتا ہوں چشمِ تر میں
کبھی اس پار اُتر کر دیکھتا ہوں

نئے موسم کی شدت سے ہوا میں
بدلتے رُخ کے تیور دیکھتا ہوں

میں عرفانِ حقیقت کی نظر سے
خودی کو خود سے باہر دیکھتا ہوں

☆

میرا صحرائیوں سے رشتہ ہے
دور کے بھائیوں سے رشتہ ہے

اک سزا ہوگئی ہے آگاہی
جب سے دانائیوں سے رشتہ ہے

روشنی تو گزر گئی چھت سے!
میرا پرچھائیوں سے رشتہ ہے

مثلِ یوسف ہوں بر سرِ بازار
ساری رُسوائیوں سے رشتہ ہے

میں اُترتا ہوں فرد کے دل میں
میرا گہرائیوں سے رشتہ ہے

کل وہی اجنبی نہ ہوں عرفاںؔ
آج جن بھائیوں سے رشتہ ہے

☆

کبھی شعور کبھی لاشعور تک دیکھا
بکھر کے میں نے بہت دور دور تک دیکھا

تلاش مجھ کو کیا کائنات نے میری
مرے سفر نے مجھے کوہ طور تک دیکھا

وہ سرورق تھا کہ چہرہ اسی کو پڑھتا رہا
کتاب کھولی نہ بین السطور تک دیکھا

مآلِ صبح میں بھی اکتسابِ شام کی دھند
مشاہدات نے ظلمت سے نور تک دیکھا

ہر ایک لمحے کی صنعت گری کہاں تک ہے
نگاہِ وقت نے یومِ نشور تک دیکھا

یہ گام گام زمین کی بہشتِ عرفاں ہیں
خیال و خواب کی دنیا نے حور تک دیکھا

☆

جونہی بقا کی سمت کوئی لے گیا مجھے
لمحوں نے بانٹ بانٹ کے بکھرا دیا مجھے

وہ آج میری شکل بھی پہچانتا نہیں
وہ شخص جس نے کل ہی کہا تھا دیوتا مجھے

جب بھی تنازعات میں کی صاف گفتگو
دو دوستوں میں ایک کو کھونا پڑا مجھے

احساس تشنہ لب ہی کھڑا دیکھتا رہا
فکر و نظر کا سیلِ بہا لے گیا مجھے

چہرے نے اتنے سوانگ رچائے ہیں روز روز
لگتا ہے اپنا نام ہی نا آشنا مجھے

لاعلمیِ تیرگی سے تو کچھ خوف ہی نہ تھا
عرفانِ علم ہی نے ڈرایا سدا مجھے

☆

فاصلہ وقت کی اڑان میں ہے
زندگی سخت امتحان میں ہے

اک پرندہ اُدھر بلندی پر
اور اِدھر تیر اک کمان میں ہے

اس کا لہجہ پرایا ہے لیکن
بولتا وہ مری زبان میں ہے

کر رہا ہے مری گلی روشن
جو دریچہ مرے مکان میں ہے

فیصلہ دل نے کر دیا لیکن
فکر کی رو ابھی گمان میں ہے

اک نئی روشنی کا اذنِ سفر
آمدِ صبح کی اذان میں ہے

جانے کب ہو تصرّف عرفاںؔ
اک لمحہ جو میرے دھیان میں ہے

☆

اُسی کو مصلحتِ وقت بھی معاف کرے
جو آپ اپنے گناہوں کا اعتراف کرے

صلیب و دار بھی مصلوب ہو کے رہ جائیں
سکوتِ وقت اگر سچ کا انکشاف کرے

اسی اصول پہ جاری ہے ارتقاء کا سفر
جدید ذہن روایت سے انحراف کرے

نظامِ آتش و آہن کو بے اثر کر دے
وہ بوند بوند جو پتھر میں بھی شگاف کرے

حصارِ کہنہ سے عرفاںؔ مفر نہیں ورنہ
نیا وجود نئی روح کا طواف کرے

☆

قسم ہے اس پل کی جب تجھے دیکھا دیوانہ وار دیکھا
وجود سے ماورا بھی تجھ کو خیال کے آر پار دیکھا

نظر پڑی ہے جہاں بھی تم پر تو صرف زلفوں کا ذکر ہی کیا
تمہارے ملبوس پر بھی میں نے ہواؤں کا اختیار دیکھا

سحر سے پہلے مہکنے والی وہ شب کہیں لوٹ کر نہ جائے
تھکی ہوئی شام نے جو میرا کبھی در انتظار دیکھا

خود اپنی تہذیب کے سفر میں جو میں نے تاریخ کو کھنگالا
شعور کی رہ گزر سے آگے تری نظر کا حصار دیکھا

نہ میں' وہ میں تھا' نہ تم وہ تم تھے' بس اک تسلسل تھا دائروں کا
جو میں نے آنکھوں کے سامنے سے خرد کا پردہ اتار دیکھا

نوائے عرفاں کی لہر تھی یا صدائے دل نغمہ زن ہوئی تھی
کہ میں نے دشتِ گماں کے اندر خود اپنا سینہ فگار دیکھا

☆

اک حکم کی سراپا تعمیل ہو رہا ہوں
میں روشنی میں پھر سے تحلیل ہو رہا ہوں

تہذیب کی بقا کا اک سلسلہ ہوں لیکن
تاریخ کے سفر کی تمثیل ہو رہا ہوں

اک عمر کی مسافت پوری ہوئی تو جانا
پہلے تھا اک سمندر اب جھیل ہو رہا ہوں

اپنے ہی جیسا جب میں اُس کو بنا نہ پایا
خود اس کے آئنے میں تبدیل ہو رہا ہوں

عرفانؔ زندگی کی اک جستجو کی خاطر
کیا جانے میں کہاں تک ترسیل ہو رہا ہوں

☆

میں بہت دور گھر سے نکل آیا تھا واپسی کا سفر سوچتا ہی رہا
جانے کیا جستجو تھی مری اور میں اس کی دہلیز پر سوچتا ہی رہا

اس سے کچھ دور اک موت ٹھہری ہوئی اس کی آنکھوں میں اک خواب سہما ہوا
میں نے دیکھا مگر کچھ نہ کر پایا اور وقت سے بے خبر سوچتا ہی رہا

نام کی کوئی تختی نہیں تھی مگر ادھ کھلا اک دریچہ شکستہ تھا در
فرش پر میری تصویر کو دیکھ کر خشت و گارے کا گھر سوچتا ہی رہا

کچھ تو ماحول میں کرب تھا وقت کا کچھ ہواؤں میں تاثیر تھی زہر کی
ان فضاؤں میں بھی آگے بڑھتا ہوا کو بہ کو دربدر سوچتا ہی رہا

میری آوازِ جاں کی سماعت لیے میری ہر آرزو کی صداقت لیے
میری ساری مسافت ادھوری رہی میں براہِ دگر سوچتا ہی رہا

آگہی کے لیے روشنی کے لیے میں جو پہنچا تو کس کو پتہ چل سکا
دشتِ عرفاں کے ماحول میں، میں کہاں کس طرح اس قدر سوچتا ہی رہا

☆

زندگی رُک گئی روشنی بجھ گئی لوگ بے چین ہیں شہر خاموش ہے
یہ ہوا جانے کیسے کہاں سے چلی لوگ بے چین ہیں شہر خاموش ہے

گم شدہ ہوگیا عہدِ ماضی مگر آنے والی صدی کے تقاضے دگر
ٹوٹتا جارہا ہے نیا آدمی لوگ بے چین ہیں شہر خاموش ہے

توڑنا تھا جسے اک حصارِ نظر اُس نے توڑا ہے آئینۂ معتبر
یُوں سزا ہوگئی ساری خود آگہی لوگ بے چین ہیں شہر خاموش ہے

خون سے تر بتر راستوں پر رواں ذہن بھی خونچکاں دل بھی آتش بجاں
ایک ہی جُرم کے ہیں بہانے کئی لوگ بے چین ہیں شہر خاموش ہے

گھر میں تنہائیاں ' وہم اور وسوسے گھر سے نکلو تو ہیں منتظر حادثے
ہر طرف بے حسی' بے بسی' بے کسی لوگ بے چین ہیں شہر خاموش ہے

شہرِ عرفاں کی جانب قدم ہیں مگر گھپ اندھیرے سے خائف ہے دل کی ڈگر
میرے اللہ کچھ روشنی ! روشنی لوگ بے چین ہیں شہر خاموش ہے

☆

محسوس تو ہوتے ہیں مخاطب نہیں ہوتے
آئینے میں کچھ عکس مناسب نہیں ہوتے

تہذیب کو تاریخ بنا دیتے ہیں لیکن
ہم اپنی ہی تقدیر کے کاتب نہیں ہوتے

تحریر جہاں ہوتی ہے کچھ حسبِ موافق
الفاظ وہاں حسبِ مراتب نہیں ہوتے

راس آتے نہیں آنکھوں کو سارے ہی مناظر
رنگوں میں سبھی رنگ تو جاذب نہیں ہوتے

خود دار ہیں اور دار ہے پہچان ہماری
ہم جو بھی ہیں جذبات کے غاصب نہیں ہوتے

لمحات کا عرفان جنہیں ہوتا ہے وہ لوگ
کیوں وقت کی رفتار پہ غالب نہیں ہوتے

☆

لہو آلود خنجر بولتا ہے!
کہ مستقبل کا منظر بولتا ہے!

چیخ کر ٹوٹ جاتی ہیں چٹانیں
کوئی جب قتل ہو کر بولتا ہے!

ہَوا خود سے نہیں کہتی کہیں کچھ
ہَوا کا شور گھر گھر بولتا ہے

بدن کے دُکھ کی ہوتی ہے تلافی
قلم ہو کر جہاں سر بولتا ہے

کھڑا تو ہوں مقابل آئنے کے
یہ دیکھوں کون کس پر بولتا ہے

تلاشِ شہرِ عرفاںؔ کے سفر میں
محبت کا پیمبر بولتا ہے!

☆

قرطاس پہ بن بن کے تصویریں اُلجھتی ہیں
مجھ سے مرے خوابوں کی تعبیریں اُلجھتی ہیں

تفہیم صحیفوں کی سمجھوں تو میں کیا سمجھوں
ہر عہد میں لفظوں کی تفسیریں اُلجھتی ہیں

جو سوچا تھا لکھا ہے' جو لکھا مقابل ہے
اب پڑھتا ہوں تو مجھ سے تحریریں اُلجھتی ہیں

منصف کا بھروسہ کیا جو چاہے وہی لکھ دے
ایوانِ عدالت میں تعزیریں اُلجھتی ہیں

دادا کی وصیت بھی دُھندلائی پڑھوں کیسے
سو سال گزرنے پر تسطیریں بدلتی ہیں

ہم زاد ہے میرا ہی اور عکس بھی میرا' پھر
کیوں شیشۂ عرفاں میں تقدیریں اُلجھتی ہیں

☆

رنگ اور خوشبو بکھراتی اک شام جو آئی رات
ہَوا میں اُڑتا آنچل دیکھ کے کچھ شرمائی رات

آنگن میں بیلے کی کلیاں کھلنے کو بیتاب
باہر بھیگی بھیگی ہَوا میں رُت گدرائی رات

تپتی دھوپ تھکن سے چُور بدن کی پیاس کے ساتھ
پچھلے پہر کی سَرد ہَوا اور وہ صحرائی رات

دن بھر دھول کی تہہ جم کر جب میلا ہُوا گلشن
پتّے پتّے کو شبنم سے پھر دھلوائی رات

یاسمین کی خوشبو سے جونہی مہکیں زُلفیں
اَبر آلود فضا سے دن کو مجھ میں سمائی رات

☆

نہ چہرے سے نہ ملبوس بدن سے
مجھے پرکھو مرے دیوانے پن سے

پڑھو عمر گذشتہ کی کہانی
جبیں پر نقش تحریر کہن سے

سنہری شام اور ساحل کی کشتی
نہ ڈوبے گی ہواؤں کے چلن سے

ہجوم بزم آرائی سے بہتر
غلط لوگوں کا اُٹھنا انجمن سے

رہا میں سر بکف تو پائی میں نے
حیاتِ جاوداں دار و رسن سے

مجھے اب چاہیے آہنگِ عرفاں
ہے میرا رابطہ شہر سخن سے

☆

صدا پیغام ہوتی جا رہی ہے
نظر الہام ہوتی جا رہی ہے

تری تحریر میری ڈائری میں
اک استفہام ہوتی جا رہی ہے

شناسا بوجھ بنتے جا رہے ہیں
شکایت عام ہوتی جا رہی ہے

ہماری گفتگو کی ایک ساعت!
بہت بدنام ہوتی جا رہی ہے

جنوں کے ایک دشتِ بیخودی میں
خودی الزام ہوتی جا رہی ہے

غمِ عرفاںؔ پہ چھا جانے کی خواہش
بہت ناکام ہوتی جا رہی ہے

☆

اس جہاں سے اُس جہاں کا رابطہ روشن کرے
چشمِ بینا ذات کا ہر آئنہ روشن کرے

وقت کی دیوار کے دونوں طرف میری نظر
ماورا ہر زندگی کا زاویہ روشن کرے

جو نہ دیکھے روشنی بھی حادثہ اُس کے لیے
دیکھ لے تو اک کرن بھی انتہا روشن کرے

بند کمرہ ' طاق کی محراب دھویں کی لکیر
جل بجھی یادوں کو کیا کوئی دیا روشن کرے

ایک خواہش اُسکی حسرت لے کے ڈوبے شام کو
اک تمنا صبح کی بادِ صبا روشن کرے

اُسکی آنکھوں کے اُجالے سے عبارت اک سفر
جلوۂ عرفاں کا سارا ماجرا روشن کرے

☆

عکس کی کہانی کا اقتباس ہم ہی تھے
آئنے کے باہر بھی آس پاس ہم ہی تھے

جب شعورِ انسانی رابطے کا پیاسا تھا
حرف و صوتِ علم و فن کی اساس ہم ہی تھے

مقتدر محبت کی شکوہ سنج محفل میں
خامشی کو اپنائے پُرسپاس ہم ہی تھے

فاصلوں نے لمحوں کو منتشر کیا تو پھر
اعتبارِ ہستی کی ایک آس ہم ہی تھے

مقتلِ مشیّت میں موجِ خوں نے بھی دیکھا
زندگی کے عرفاں کا اختصاص ہم ہی تھے

☆

گزر رہا ہے جو اس امتحان کی قیمت
ہُوا چکائے گی اب میری جان کی قیمت

تمہارے نام کی تختی ہے اُدھ مِٹی لیکن
بڑھا رہی ہے شکستہ مکان کی قیمت

میں لکھ رہا ہوں خود اپنی حیات کاغذ پر
مجھے پتہ ہے لہو داستان کی قیمت

خلا کی سیر سے لوٹا تو یہ ہُوا معلوم
میری زمیں ہے ترے آسمان کی قیمت

چڑھی تو سڑکوں پر انسان قتل ہوتا گیا
زباں سے نکلے ہوئے اِک بیان کی قیمت

سفر شناس ہے ملاح کی نظر لیکن
ہُوا سے پوچھو کسی بادبان کی قیمت

خیال و خواب سے آگے حصارِ عرفاںؔ میں
لگا رہا ہے کوئی میری آن کی قیمت

☆

پھیلتی جا رہی ہے مسافت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے
اُس کے بس میں ہے روزِ قیامت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

اِک سفر خواب کا منزلِ دار تک ہے مسلّط میرے فہم و ادراک پر
دسترس میں نہیں کوئی ساعت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

صبح سے شام تک میں تعاقب میں ہوں' اس کی آواز کے لہجہ راز کے
اُس سے مِلنا ہے میری عبادت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

ٹوٹ کر اِک شجر سے یہاں آ گیا برگِ آوارہ کی طرح اُڑتا ہُوا
مَیں ہوا میں ہوں زیرِ حراست مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

میں نے سیکھا ہے تاریخ سے ہر سبق میں نے دیکھا ہے تہذیب کا سینہ شق
بھول جانے کی ہے مجھ کو عادت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

ایک سیلاب مجھ کو بہاتا ہُوا لے کے آیا نہ جانے کہاں سے کہاں
شورِ دریا سے ہوں بے سماعت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

شہرِ عرفاںؔ کو جاتی ہوئی اِک سڑک دیکھتی جا رہی ہے مجھے دُور تک
ہے الگ میری شکل و شباہت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

☆

شعور پیاسا سمندر ہے کیا کیا جائے
یہ کائنات کا منظر ہے کیا کیا جائے

نفس نفس میں مقدر ہوا کا رخ بن کر
حیات میرا مقدر ہے کیا کیا جائے

نگاہ دیکھ نہ پائی ہے آج تک جس کو
وہ میری روح کے اندر ہے کیا کیا جائے

دراڑیں پڑ گئیں مٹی میں ہونٹ خشک ہوئے
زمین ویسی ہی بنجر ہے کیا کیا جائے

ادا نہ ہو سکا عرفان فکر کا جو قرض
مرے شعور کا محور ہے کیا کیا جائے

☆

اس کی آنکھیں تھیں یا کوئی خواب تھا ٹھہرا ہوا
سوچتا کیا محور اعصاب تھا ٹھہرا ہوا

ڈوبنے کے بعد کا منظر بس اتنا یاد ہے
اک ہیولہ سا گرداب تھا ٹھہرا ہوا

اس کو میں بھی دیکھ کر پلٹا تو پتھر بن گیا
جس جگہ اک منظر نایاب تھا ٹھہرا ہوا

سطح پر جو تیز رو لہریں تھیں ان کو کیا خبر
دشت وحشت ایک زیرِ آب تھا ٹھہرا ہوا

اپنی ہی تہذیب کے آثار دیکھے تھے جہاں
گمشدہ تاریخ کا اک باب تھا ٹھہرا ہوا

جھیل کے اس پار بھی اِک چاند چہرے کا وجود
جھیل کے اندر بھی اک مہتاب تھا ٹھہرا ہوا

پیڑ کے نیچے جو بیٹھا وہ سکندر ہو گیا
ڈال پر جس کے کوئی سرخاب تھا بیٹھا ہوا

خشک سالی گاؤں کی سہہ کر جو لوٹا تو کھلا
جانے کب سے شہر میں سیلاب تھا ٹھہرا ہوا

بزمِ عرفاں تک جو پہنچا تو وہاں میرے لیے
اک اذنِ منبر و محراب تھا ٹھہرا ہوا

☆

اصولوں پر کوئی سودا نہ طے ہو پایا تھا اس دن
مگر دونوں نے اپنے آپ کو منوایا تھا اس دن

یونہی بے وجہ تم سے وہ تعلق ٹوٹ جانے پر
مرے کمرے کا سناٹا مجھے راس آیا تھا اس دن

خفا ہو کر جو تم سے آ گیا ساحل پہ تنہا تو
سمندر نے قریب آ کر مجھے سمجھایا تھا اُس دن

وہ دن بھی عام دن جیسا تھا لیکن روبرو اس کے
نہ جانے کون تھا جب آئنہ شرمایا تھا اس دن

تقاضائے شب عرفاں نے صبح نو سے پہلے ہی
تری دہلیز تک آخر مجھے پہنچایا تھا اس دن

☆

گہرائی الگ لہروں کا پھیلاؤ الگ ہے
ساحل سے مگر موجوں کا ٹکراؤ الگ ہے

لکھے ہوئے ہر حرف کی تاثیر سے بڑھ کر
بولے ہوئے الفاظ کا پتھراؤ الگ ہے

انسان کا تہذیب سے جو ربط ہے اس میں
تاریخ الگ وقت کا برتاؤ الگ ہے

جو خود کو سمیٹے ہوئے سالم ہے بظاہر
اس ٹوٹے ہوئے شخص کا بکھراؤ الگ ہے

ہو جس میں سمندر کا سفر اس کے مقابل
لگتی ہے کنارے سے جو وہ ناؤ الگ ہے

یہ جال الگ ہاتھ میں بنتی ہیں لکیریں
قسمت کے ستاروں کا وہ الجھاؤ الگ ہے

رنگوں کا تقاضا ہو کہ عرفان کا منظر
آئینے میں ہر عکس کا ٹھہراؤ الگ ہے

☆

حدِ امکاں میں جستجو کا سفر
ہے ادھورا ابھی لہو کا سفر

ہو مکمل تو ایک سجدہ ہے
ایک اک قطرۂ وضو کا سفر

میری تخلیق میں مہکتا رہا
اس کی سانسوں کی مشکبو کا سفر

عہدِ نو کے سراغ میں گم ہے
میرے افکار کی نمو کا سفر

جانے کب سے رِدا کا ہے محتاج
بنتِ حوّا کی آبرو کا سفر

عکسِ عرفان کا ساتھ دیتا رہا
چشمِ بینا میں روبرو کا سفر

☆

جس طرح روشنی قریب ملی جب جلے ہیں چراغ شام کے بعد
زندگی کو قریب سے دیکھا اپنی بستی میں قتل عام کے بعد

ایک مدت گزر گئی اب تک ہے ادھورا مطالعہ میرا
بند کردی گئی کتاب جہاں اک جھروکے سے اک پیام کے بعد

ایک تہذیب دفن ہونے لگی تو مکافات کے عمل سے پھر
ایشیا کے جنوب نے لکھی ایک تاریخ روم و شام کے بعد

تیرے ماحول کے تناظر میں سوچتا ہوں یہی مناسب ہے
میرا غم مجھ میں جذب ہو جائے تیری خوشیوں کے احترام کے بعد

خشک سالی سے جو دعا ابھری وہ اثر لائی قہر کی صورت
ایک سیلاب ہم کو لے ڈوبا تیز بارش کے اہتمام کے بعد

جب ہواؤں نے زور دکھلایا ٹین کی چھت کو اڑتے دیکھا تھا
کون دیکھے اب اپنی آنکھوں سے گھر کی دیواریں انہدام کے بعد

حرف اظہار کر نہیں سکتا چشمِ عرفاں نے گرچہ دیکھا تھا
ایک مقتول قتل سے پہلے ایک انسان انتقام کے بعد

☆

ہماری خوش بیانی لکھ رہی ہے
نظر دل کی کہانی لکھ رہی ہے

زمیں اپنے ہی بچوں کے لہو سے
کتاب خونچکانی لکھ رہی ہے

سمندر میں بھنور کا ایک منظر
ہوا کی مہربانی لکھ رہی ہے

تعلق دھوپ سے کیا ہے شجر کا
سفر کے بے مکانی لکھ رہی ہے

جو اوجھل ہے کناروں کی نظر سے
وہ دریا کی روانی لکھ رہی ہے

نگاہیں دھند میں کچھ پڑھ رہی ہیں
دلوں کی بدگمانی لکھ رہی ہے

مری تحریر میں خوشبوئے عرفاںؔ
کہانی در کہانی لکھ رہی ہے

☆

وہ شناسا سہی انجان بھی ہوسکتا ہے
میں پلٹ آؤں یہ امکان بھی ہوسکتا ہے

جس نے گرداب سے ساحل پہ مجھے لا پھینکا
وہ سمندر مری پہچان بھی ہوسکتا ہے

تیری تصویر مقابل ہو ضروری تو نہیں
سامنے میز پہ گلدان بھی ہوسکتا ہے

تیری یادوں کے تصرف میں یہ کمرہ اور میں
مجھ کو تنہائی میں وجدان بھی ہوسکتا ہے

میری تہذیب مٹاؤ گے تو میرا قلم
میری تاریخ کا عنوان بھی ہوسکتا ہے

روح صدیوں کی مسافت کو سمو لے لیکن
جسم اک لمحے میں بے جان بھی ہوسکتا ہے

تیری قربت سے الگ ہٹ کے تجھے پہچانوں
میری آنکھوں میں وہ عرفان بھی ہوسکتا ہے

☆

اگرچہ ہزاروں شناسائیاں ہیں
مگر میری ہم رقص تنہائیاں ہیں

جسے چھوڑ آیا وہی روشنی تھی
کہ اب سامنے میری پرچھائیاں ہیں

مری راہ کے اس طرف جلتا جنگل
اُدھر گہری و پُر خطر کھائیاں ہیں

کوئی اور کیا ہوگا دشمن کہ مجھ سے
نبرد آزما میری دانائیاں ہیں

شب ہجر سے وصل کی صبح نو تک
بکھرتی ہوئی تیری رعنائیاں ہیں

کسی دن نہ ہوجائیں مدِ مقابل
تعاقب میں میرے جو رسوائیاں ہیں

بجز حرفِ عرفاںؔ کتابِ نظر میں
دل و ذہن کی خامہ فرسائیاں ہیں

☆

ہوا کے شور پہ گزرا گمان پتھر کا
کہانی ریت کی تھی اور بیان پتھر کا

بھڑکتے حسن کی لو کب سہار سکتا تھا
چٹخ کے ٹوٹ گیا شمع دان پتھر کا

جو سنگسار ہوا وہ گناہ گار نہ تھا
مگر وہ لیتا رہا امتحان پتھر کا

وہ ایک پھول ہی تھا اس کے ہاتھ میں جس نے
مری جبین پہ چھوڑا نشان پتھر کا

جو موج موج کناروں سے ہمکنار ہوئی
تو سایہ دینے لگا سائبان پتھر کا

جہاں تلاش کیا میں نے شمع عرفاں کو
زمین موم کی نکلی مکان پتھر کا

☆

بہت حسین سہی آن بان لفظوں کی
مگر ادھوری ہے یہ داستان لفظوں کی

جو راز فاش ہوا حرفِ صد معانی کا
تو گر کے ٹوٹ گئی اک چٹان لفظوں کی

کوئی گناہ بھی ثابت نہ ہو سکے گا کبھی
ملے گی جرم کو جب تک امان لفظوں کی

کسی کی آنکھوں نے بکھرائے شش جہات کے رنگ
کسی کو مل گئی ہے زبان لفظوں کی

حروفِ ربط تکلم سے خوف کھاتے ہیں
نکل نہ جائے کہیں ساری جان لفظوں کی

زمیں کے رشتوں نے پابند کر دیا ورنہ
زمانہ پا نہ سکا تھا اُڑان لفظوں کی

جہانِ شعر میں عرفاؔن زندگی کے لیے
متاعِ فکر اُگلتی ہے کان لفظوں کی

قمری اپنی دھن میں تھی پروازوں کی
نیت کس نے دیکھی تھی شہبازوں کی

صورت دیکھی تو پتھر بن جاؤں گا
اپنا پیچھا کرتی کچھ آوازوں کی

کھولو مت ممکن ہے کہانی ایک ہی ہو
کھنڈر محل کے بند سبھی دروازوں کی

کچھ رازوں کی قیمت صدیاں ہوتی ہیں
یا پھر قدر نہیں ہوتی کچھ رازوں کی

نغمۂ عرفاں کی خاموشی میں پنہاں
آوازیں ہیں وقت کے سارے سازوں کی

☆

قبول و ردِ مسلسل کے جال سے پہلے
میں پختہ عزم تھا تیرے خیال سے پہلے

مرے عروج کی راہوں میں وہ پڑاؤ بھی تھا
جہاں ٹھہرنا تھا مجھ کو زوال سے پہلے

وہ عکس آئینہ اب بھی تلاش کرنا ہے
جو اُس میں اترا تھا تیرے جمال سے پہلے

ابد کی سمت چلا تو پتہ لگا مجھ کو
یقین کیا ہے کسی احتمال سے پہلے

جو اَب جنوب میں طوفان بن کے اُبھری ہیں
چلی تھیں یہ بھی ہوائیں شمال سے پہلے

ازل کی صبح کا عرفان بھی تو میں ہی تھا
طویل سلسلۂ ماہ و سال سے پہلے

☆

پڑاؤ تھا کہ قدم رک گیا نہیں معلوم
سفر کہاں سے کہاں تک ہوا نہیں معلوم

میں عصر گاہ میں پوچھوں ترا پتہ کس سے
یہاں مجھے ہی خود اپنا پتہ نہیں معلوم

تمام عمر مری خاک تشنہ تر ہی رہی
کہاں سے کیسے وہ دریا بہا نہیں معلوم

ہمارے بیچ مکمل گریز کا پردہ
ہوا کے چلتے ہی کب اٹھ گیا نہیں معلوم

نظر تو سارے مناظر کو جذب کر لے گی
کہ دیکھنا ہے اُسے کس جگہ نہیں معلوم

بلندیوں کو اٹھے ہاتھ تھک گئے ہیں مگر
اثر ہو جس میں وہ حرفِ دعا نہیں معلوم

کھلا ہے کیسے اچانک شعورِ عرفاںؔ پر
متاعِ فکر کا حیرت کدہ نہیں معلوم

☆

حصارِ ذات کو دیوار کرلیا میں نے
ہیولہ اپنا گرفتار کرلیا میں نے

مسافتوں میں کہیں بھی کوئی پڑاؤ نہ تھا
سفر کی دھوپ کو دستار کرلیا میں نے

سمٹ کے آگئے سب فاصلے تو پل بھر میں
شعورِ وقت کو رفتار کرلیا میں نے

خود اپنی روشنیٔ طبع مرتکز کرکے
حدودِ فکر کو بھی پار کرلیا میں نے

زمینِ زیست میں خود کو ہی بو دیا اور پھر
شجرِ جنوں کا ثمر بار کرلیا میں نے

عجیب خواب تھا کہ دیکھتے ہی اپنے ساتھ
تمام شہر کو بیدار کرلیا میں نے

کسی کے جلوے میں عرفانِ زندگی کے لیے
خود اپنے آپ کو تیار کرلیا میں نے

☆

نیا خیال نئی فکر کی پناہ میں ہے
مرا شعور بدلتی ہوئی نگاہ میں ہے

تلاش میں ہوں مَیں جس کی بتاؤں کیسے کہ وہ
نظر سے دور مگر دل کی بارگاہ میں ہے

چھپائے چھپ نہیں سکتی لباس سادہ میں
وہ ایک نخوتِ پنہاں جو کج کلاہ میں ہے

سکونِ سجدہ مجھے گر نہیں ملا ہے تو کیا؟
گناہ کا کوئی سایہ بھی سجدہ گاہ میں ہے

مری لغت میں خرد کا کہیں بھی ذکر نہیں
مرے جنوں کا تقاضا تو خانقاہ میں ہے

فرازِ دار پہ دیکھی ہے اس کی آنکھوں سے
وہ روشنی جو کسی چشمِ بے گناہ میں ہے

نفس کی آمد و شد تک مسافتوں کی قسم
مرا سفر تو ابھی دشتِ دل کی راہ میں ہے

مشاہدات کا عرفاں تو ہوا لیکن
نہ دیکھ پایا وہ جو منظرِ تباہ میں ہے

☆

نظر کا رابطہ ٹوٹا ہوا ہے
قلم کیا جانے کیا کیا لکھ رہا ہے

مقفل سارے دروازے پڑے ہیں
ہواؤں سے دریچہ کھل گیا ہے

میں کانٹوں پر چلا ہوں پا برہنہ
مگر یہ کیا؟ کہ رستہ ہانپتا ہے

ہوں تپتی ریت کا صحرا میں لیکن
کنارے سے مرے دریا بہا ہے

لکیریں ہاتھ کی الجھی ہیں جب بھی
تمناؤں کو بس میں کرلیا ہے

وہ خاموشی سے کیسے ربط رکھے
نظر کو جس کی گویائی عطا ہے

مرے دل کی بغاوت سے نہ پوچھو
عمل کا ہاتھ کیوں لرزا ہوا ہے

شعور زندگی تک راہِ عرفاں
ہر اک لمحہ محبت آشنا ہے

باب ۷

آزاد نظمیں

گو کہ غالب عرفان کی غزل، ان کے تخلیقی اظہار میں مرکزی اور محور حیثیت رکھتی ہے مگر نظمیہ اظہار بھی خاصے کی چیز ہے۔ بلکہ پابند منظومات کی بہ نسبت آزاد نظم زیادہ خوبصورت، رواں دواں ،شعور سے آراستہ اور متاثر کن ہے مثلاً روح قائد کا پیغام، دستک، خود کلامی، سانحہ 18 اکتوبر 2007ء لا حاصل، وقت منتظر ہے پھر! 'ایک مترنم آواز روشنی کا سفر میرے خوابوں کی رخشندہ دہلیز پر' ہماری پہچان مٹ رہی ہے' شگفتگی کا تسلسل، ارتقاء کی نئی اک دہلیز پر!، یوم استقلال، یوم پاکستان اور لا فانی۔

روح قائد کا پیغام

اگر یہ سچ ہے' کہ میں نے تم کو شعور بخشا
صدی صدی کی طویل راہوں کے بیچ میں
اک نیا موڑ میرا منتظر تھا!
اور یہ بھی سچ ہے' خلوص و مہر و وفا کی
تابندہ روشنی کا وہ طور بھی وہیں کھڑا تھا
جہاں کی روشن شفیق کرنوں کی ہر کرن نے
دلوں میں جذبے جگائے رکھے
محبتوں کے سہانے سپنے سجائے رکھے'
یگانگی کی مہکتی خوشبو نفس نفس میں
بسائے رکھی
تو پھر یہ نفرت کی شعلگی کیوں؟
یہ کیسی وحشت ہے؟ کیا جنوں ہے؟

یہ لاشیں کیسی؟ یہ کس کا خوں ہے؟
یہ کیسے نیرو کی بانسری تم بجا رہے ہو!
اے میرے اہلِ وطن بتاؤ
کہ آج تم پھر کہاں کھڑے ہو
خود اپنا تم... احتساب کرلو
تمہاری تاریخ ہر قدم پر تمہارا ماضی دکھا رہی ہے
مقامِ حیرت ہے تم نے اب تک بھی کچھ نہ سیکھا
میں کیا کہوں تم سے کیا بتاؤں!
کہ میری محنت کے اس ثمر کو تمہارے قول و عمل کی
دنیا نے کس بلندی سے کیسی پستی پہ لا کے پٹکا
یہ آج شرمندگی سے بھیگی ہوئی جبیں پر عقیدتوں
کے نشان کیسے؟ چلو میں اک بات صاف کہہ دوں
اگر ہماری زمیں پہ ناحق لہو کی اک بوند بھی
بھی ہے! اگر تمہاری نظر میں نفلی رفاقتوں
کا سفر نہیں ہے!!
تو پھر وطن کی کوئی زمیں معتبر نہیں ہے!

☆

دستک

رنگ اور خوشبو سے بارش کا موسم بھی
آوازوں کا پس منظر کہہ دیتا ہے
اک آواز ازل میں بھی گونجی تھی کہیں
جس کی لہریں محوِ سفر ہیں سمتِ ابد
لیکن یہ موسم جو دستک دیتا ہے
لیکن یہ آواز جو مجھ سے کہتی ہے

لیکن یہ کچھ رنگ جو مجھ کو لبھاتے ہیں
ایک تقاضا بن کر مجھ سے مخاطب ہیں
کیا آواز بھی پیار کی صُورت ہوتی ہے
کہاں کہاں تک دل کی لہریں جاتی ہیں
دل کا دریا کہاں کہاں سے بہتا ہے!
ہوا کی لہروں میں پنہاں ہے کیسا راز
کیا دیتی ہیں رنگ اور خوشبو کو پیغام

☆

خود کلامی

کتابِ دل کے ورق یوں اُلٹتے جاتے ہیں
اذیتوں کے بھی زخم کے پس پردہ
یہ کون ہے جو نئی چہرگی کے پَرتو میں
سوال بن کے مرے روبرو چلا آیا
جبیں پہ فکر کی شکنیں لیے یہ لب بستہ
شعورِ وقت کا ملبوس پہنے آیا ہے
یہ چہرہ کس کا ہے سادہ مگر سوالی بھی
یہ کون مجھ سے مسلسل کلام کرتا ہے
میں سوچتا ہوں یہ میں ہوں کہ میری تنہائی
بپھر رہی ہے مجھی پر بمثلِ سونامی! ؎
پریشاں ذہن کی لہروں سے میری نس نس میں
گزارتی ہے نئی وارداتِ قلب و نظر

☆

؎ سونامی: سمندر کے اندر چٹانوں کو توڑتا ہوا زلزلہ۔

وقت منتظر ہے پھر!

لمحہ لمحہ صدیوں کا روپ لے کے ٹھہرا ہے
گرد اڑ رہی ہے اور گردشوں کا پھیرا ہے
آتشیں بگولوں کا رقص ہو رہا ہے۔ یا
آدمی میں پوشیدہ، وحشیانہ پن پھر سے
شعلۂ جبلّت کی شکل میں اُبھرتا ہے
زندگی جہنم کی شعلگی میں جلتی ہے
ہر طرف دھواں صورت
دھند کی کثافت میں
دہشتوں کے منظر ہیں
فرد پیار کا پیاسا، گولیاں نگلتا ہے
اور لہو اگلتا ہے
خون بہتا رہتا ہے
خون انتقالی بھی! خون جلالی بھی!!
خون انضمامی بھی!! خون انتقامی بھی!!!
خون جسم میں اترے
تو حیات کی صورت، ہر نفس ابھرتا ہے
خون آنکھ میں اترے
تو ستم کی بنیادیں بے ثبات کرتا ہے
وقت راہ تکتا ہے
وقت منتظر ہے پھر

☆

ایک مترنم آواز

من چاہے جب چاہت کا نغمہ گونجے
ایک آواز سراپا صورت بن جائے
ایک ندی اٹھلاتی گاتی بجتی ہوئی
ہوا کے ساتھ کوئی سرگوشی بن جائے
پھر شفاف کھنکتی آوازوں کا سفر
دل کی دھڑکن بن کر سر کی طرح گائے
رس گھولے کانوں میں پیار کا گیت کوئی
تب اس وقت میں گم ہو کر
اس نغمے کی
ایک طلسمی جست کے قابو میں آؤں
دشتِ تحیر کی دنیا میں جا پہنچوں
ایک خیالی عکس کو تابندہ دیکھوں
نغمے کے اک روپ کو میں زندہ دیکھوں

☆

روشنی کا سفر

آنکھوں آنکھوں کے تصادم کا سفر
روشنی سے روشنی کا سلسلہ!
اک طرف خاموشیوں کی گفتگو
دوسری جانب دلِ شوریدہ میں
قرب کی خواہش، محبت کی کشش
اک تذبذب، ہچکچاہٹ، کشمکش
رفتہ رفتہ اشتیاق و انقلاب
جستجو، پر پیچ راہِ جستجو!

حوصلوں کا آرزو سے اتفاق
دل کی سُونی وادیوں میں رونقیں
مشترک جذبات یکساں خواہشیں
منتظر جن کی تخیلی ساعتیں
ساعتیں.....تنہائیوں کی رازداں
ساعتیں.....ہوش وخرد کی پاسباں
ساعتیں.....بے ہوشیوں کی ہم زبان
ساعتیں.....پَل پَل پیامِ زندگی!
ساعتیں.....عکاس بھی معکوس بھی!
زندگی کا زندگی سے انجذاب
زندگی میں رنگ ونکہت بھر گیا
روشنی کو دے گیا منظر نیا!
جھلملاتی لمس کی دہلیز پر
آنکھوں آنکھوں کے تصادم کا سفر
روشنی کو روشنی دیتا گیا
روشنی پرواز کرتی ہی رہی
روشنی.....ہر شوق کی حدِ رسا
روشنی.....فطرت کی بزمِ ارتقا
روشنی عرشِ معلّٰی کی پناہ!

☆

میرے خوابوں کی رخشندہ دہلیز پر!

چادریں موسموں کی بدلتی رہیں
وقت کٹتا رہا، ہم گزرتے رہے
کم نگاہی کے کربِ شرر خیز سے
منظرِ جسم وجاں، رقت انگیز سے

میں بھٹکنے لگا
میری آنکھوں میں شہرِ تمنا کا منظر جگا
میری نظروں میں ماضی کا ظلمت کدہ
یوں اُجاگر ہوا
جیسے لمحوں کی زنجیر، تصویر ہو
جیسے صدیوں کی تاریخ تحریر ہو
جیسے باطن پہ ظاہر کی تاثیر ہو
جیسے اک خواب کی کوئی تعبیر ہو
اور پھر...... ناگہاں
لمحہ لمحہ کئی نقش اُبھرے مگر
پس زنداں دریچے کے اُس پار تک
گھپ اندھیرا ہی تھا
کوئی تارا نہ تھا
استعارہ نہ تھا
میرا چہرہ تھا اور تختۂ دار تھا
میرے خوابوں کی رخشندہ دہلیز

☆

ہماری پہچان مٹ رہی ہے

ہم آج اپنے ہی خون میں
تر بہ تر کھڑے
اک قبیح منظر کے سامنے ہیں
ندامتوں کا پہاڑ سر پر اٹھائے
اب تک نہیں تھکے ہیں
ہوس کے دلدل میں دھنس رہے ہیں

دلوں میں نفرت کی شعلگی ہے
ہماری صورت پگھل رہی ہے
یہ کیسی آتش ہے؟ کیسا لاوا؟؟؟
کہ ہر تعصب کی شکل، سیلِ رواں میں ڈھل کے
ہماری راہوں کے نقش سارے مٹا رہی ہے
یہ کیسی وحشت ہے؟ کیا جنوں ہے؟؟
جو وحشتوں کو فروغ دے کر
ہمارے مابین فاصلوں کو بڑھا رہا ہے
ہمارے چہروں کو نوچتا ہے، کھرونچتا ہے
ہماری پہچان مٹ رہی ہے!

☆

شکستگی کا تسلسل

دماغ کھول رہا ہے نظر کی حدت سے
شعور بول رہا ہے تھکن کی شدت سے
مرے وجود کو محسوس ہو رہا ہے ابھی
کہ موج موج سمندر کی زد میں ساحل ہے
کنارے کٹ کے گھلے جا رہے ہیں پانی میں
مرا یہ جسم بھی کٹ کٹ کے گر رہا ہے کہیں
میں روز و شب کے حوادث میں پارہ پارہ ہوں
نہ جانے کب سے میں یوں ہی بکھرتا آیا ہوں
نہ جانے اور کہاں تک بکھرتا جاؤں گا
یہ مرحلہ ہے کہاں تک قضا کے ہاتھوں میں
شکستگی کا تسلسل ہر اک ذرے پر
شکستگی کا تسلسل ہر اک ریزے تک

ارتقا کی نئی ایک دہلیز پر

ایک دہشت ہے یا کوئی بے چارگی
زندگی ہے کہ اک رقصِ آوارگی
ہر قدم خوف کی لہر سے بے اماں
ہر نفس لرزشوں کو سمیٹے ہوئے
فکر بے پر اڑانوں کی راہوں میں گم
ذہن بے جا دلیلوں میں الجھا ہوا
ہر جبیں پر شکن در شکن مسئلے
آنکھ پھر بھی محبت کا ورثہ لیے
معتبر معتبر راز پنہاں لیے
تشنگی لب پہ اظہار احساس کی
اک نئی آس کی
اپنے میراث کی، ہر دبے راز کی
ان بجھی آگ کی، ان کہے خواب کی
بیتے لمحوں کی، خوشیوں کی یادوں کے ساتھ
ڈھونڈتی ہے نئی اک صدی
ایک شرمندگی
زندگی زندگی۔ اپنی یہ زندگی
کیا بقا پائے گی کس کو راس آئے گی
ارتقا کی نئی ایک دہلیز پر!

یومِ استقلال

یہ دن
یہ جشنِ رقص و رم
یہ دن ہماری آرزوؤں کی سحر کا بانکپن
عروسِ وقت کی جبیں پہ

مثلِ ماہتاب ہے
وجودِ حسن و عشق کی
صداقتوں کا باب ہے
مرے وطن کی سرزمیں پہ
لہلہاتی کھیتیوں کے درمیاں
جفاکشوں کی آن ہے
روش روش، چمن چمن
دلوں پہ حکمران ہے
یہ دن بہت عظیم ہے
یہ دن ہمیں عزیز تر دنوں سے
بھی عزیز ہے
یہ دن
حضورِ حسن میں مآلِ عشق کی طرح
عطائے لم یزل بھی ہے
متاعِ بے بدل بھی ہے

☆

لافانی

یہ دنیا اگرچہ فانی ہے
مگر ذہن رسا کی ماورا
تخلیق کا رشتہ
کبھی فانی نہیں ہوتا
یہ رشتہ آدمی کو
ذات کی پہچان دیتا ہے
یہ رشتہ جذبۂ دل کو
خلوص و مہر کی وادی میں

لے جا کر، خیال و خواب بنتا ہے
خوشی، سچی خوشی سے
ذہن کو سیراب کرتا ہے
یہاں جب آدمی کو شاعری کا
فیض ملتا ہے
تو پھر تخلیق کی دیوی
مسلسل آگہی کا دان دیتی ہے
نیا وردان دیتی ہے
جب انساں ایک شاعر کی طرح
آئندہ منظر پیش کرتا ہے
یہ کم احساس نہیں ہوتا
جو شاعر زندگی پر کر کے
بن جاتا ہے
لافانی!

☆

باب ۸

مشاہیر کی نظر میں

مقدمہ

غالب عرفانؔ صاحب بڑے مستقل مزاج آدمی ہیں۔ایک مرتبہ انہوں نے دل میں ٹھان لی کہ اپنے پہلے مجموعۂ کلام پر پیش لفظ مجھ سے لکھوائیں گے۔تو کوئی ترغیب وترکیب اُن کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر آمادہ نہ کرسکی اور میری چھ مہینے سے زیادہ لیت ولعل اُن کے ذہن سے یہ بات محو نہ کراسکی کہ مجھے اُن کی کتاب پر چند لفظ لکھنے ہیں چند اس لیے کہ اس سے زیادہ کی سکت اور اہلیت مجھ میں نہیں ہے۔

غالب عرفانؔ صاحب نے اپنے مجموعے کا نام بہت مناسب رکھا ہے۔''آگہی سزا ہوئی۔''آگہی کا سزا ہونا ایک ایسا کلیہ ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں۔انگریزی مقولہ IGNORANCE IS BLISS کی رو سے بے خبری میں جو مسرّت موجود ہوتی ہے وہ آگہی کے ساتھ عذاب میں تبدیل ہوتی رہتی ہے معلوم نہیں یہ سلسلہ کب تک چلتا ہے۔شاید مکمل آگہی مکمل مسرّت ہو۔جس کو نروان کہتے ہیں،لیکن کتنے بودھ اس کو حاصل کر پاتے ہیں۔انسانوں اور حیوانوں کے درمیان اگر فرق علم اور جبلت یا آگہی اور بے خبری کا ہے تو حیوان،اگرچہ تکلیف کے احساس کے خالی نہیں ہوتے لیکن اُس عذاب اور تکلیف میں مبتلا نہیں ہوتے جس میں انسان اپنی انا کے احساس کے بعد مبتلا ہونے لگتا ہے۔آگہی،درونِ ذات کی ہو یا بیرونی عوامل کی پیدا کردہ،ایک کرب سے شروع ہوتی ہے۔نالہ نے جدائی کی شکایت کرتا ہے،احساسِ ذات دوئی کی تفریق

پیدا کر کے، حقیقت سے جُدائی کے کرب میں مبتلا کرتا ہے، لیکن یہ مابعد الطبیعاتی باتیں ہیں۔ ان کے رموز و اسرار سے اس وقت بحث مقصود نہیں ہے۔ اس وقت شاعر کے احساس سے جو کرب پیدا ہوتا ہے اس کا اظہار مقصود ہے۔

غالباً "شاعر" اور "آ گہی" میں بڑا قریبی اور گہرا تعلق ہے۔ اس کی ابتداء زندگی کے لذائذ اور الم کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ لذائذ بجائے خود انسانی مسرّت کا بدل نہیں بنتے، اس لیے کہ مسرّت صرف لذّت کی متلاشی نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک ایسی کُلّی کیفیت کا نام ہے، جس میں زندگی کے تضادات ایک پُر کیف آہنگ میں اس طرح تبدیل ہو جاتے ہیں جس طرح مختلف النوع آوازیں موسیقی بن جاتی ہیں۔ شاعر غذا کی لذّت، جنسی تسکین، اور آسودہ حالی کے باوجود بھی، جو اس کی زندگی میں مجد امجد اقطعوں میں اُس کو ملتی رہتی ہیں، غیر مطمئن اور نا آسودہ رہ سکتا ہے اور اپنی زندگی سے رونقوں کو معدوم پانے کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

زندگی کی رونقیں جہل نے سمیٹ لیں
آگہی سزا ہوئی ہر ذہین کے لیے

آگہی کے سزا ہونے کا عام طور پر اظہار جنوبی ایشیا کی ثقافت میں شاعری کے ذریعے ہوتا ہے۔ ہندو ثقافت اور ہندی زبان کے متعلق تو میری معلومات نہیں ہیں، البتہ غیر منقسم ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں تعلیم یافتہ اور کم تعلیم یافتہ نوجوانوں کے سنِ بلاغت تک پہنچنے کا اظہار شاعری کے ذریعے ہوتا ہے، اور عام طور پر یہ اظہار ایک نا آسودہ احساس کا اظہار ہوتا ہے، جس میں مقصود کے نہ ملنے کا احساس، ہجر، بے وفائی، معاشرے کی جفا کاریاں، ناصحوں کی نصیحتیں اور والدین کا جبر شامل ہوتا ہے۔ معاشی تنگ دستی اور ذاتی مجبوریاں بھی اسی احساس کا ایک پہلو ہوتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ متوسط طبقے کا جو تعلیمی اعتبار سے پست تر طبقے سے بہتر ہوتا ہے، جنسی اخلاق زیادہ سخت اور ثقافتی زندگی زیادہ خشک ہوتی ہے۔ اس معاشرے میں آزادانہ میل ملاپ، رقص و موسیقی اور خواہشات کا اظہار سب ایک کڑے قانون کا پابند ہوتا ہے، اور احکام امتناعی زیادہ

ہوتے ہیں مذہبی احکام کی پابندی، والدین کی اطاعت، معاشرے کے رسم ورواج کی پیروی، سب ایک نشونما پانے والی شخصیت کے لیے سدِ راہ بن جاتے ہیں، اور وہ زندگی کی لذت سے صرف چوری چھپے اور احساسِ جرم کے ساتھ ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے، غالباً اسی لیے ایک طرف جذبات کا شعور سزا کی مانند محسوس ہونے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی ثقافت میں بلوغت کی شاعری، شاعر کو دروں کی طرف متوجہ کر دیتی ہے، اور اس کی شخصیت دوربین بن جاتی ہے، اور شاعر بیرونی واقعات اور فطرت کے مناظر کی طرف متوجہ ہوتا بھی ہے تو وہ بنفسہٖ نہیں ہوتا، اور بیرونی دنیا بھی وارداتِ قلب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، سورج کی تپش میں جلال نہیں نظر آتا۔ گرمی کا احساس ہوتا ہے، باغ کے دیکھنے سے دل میں طراوت آتی ہے۔ غرض شاعر کی عمومی شخصیت ایک دروں بین شخصیت بن جاتی ہے۔

کوئی نہیں، نہ سہی اس حصار کے باہر
حصارِ ذات میں اِک جشنِ دار و گیر تو ہے

اکثر شعراء اس دروں بینی سے کبھی باہر نہیں نکل پاتے، جو نکل جاتے ہیں، بڑے شاعر بن جاتے ہیں۔

شاعری اور احساس کے حوالے سے جو بات میں نے عرض کی ہے، وہ کوئی قدری حکم (VALUE JUDGMENT) نہیں ہے۔ شاعری کا صرف مظہریاتی بیان (PHENOMENO LOGICAL DESCRIPTION) ہے۔ جن حالات کا سامنا مسلم متوسط طبقے کو ہندوستان کی سرزمین میں پچھلے دو تین سو سال سے درپیش ہے، اس کے تحت یہ بات مستبعد نہیں ہے، اور خاص طور پر بیسویں صدی کا دوسرا نصف زندگی کی جن محرومیوں اور تلخیوں کو سامنے لایا ہے، اور حالات اور سماجی ساخت نے جس طرح انسان کی زندگی کو جکڑ میں لے لیا ہے اُس کو سامنے رکھتے ہوئے دروں بینی کے علاوہ اور کچھ ممکن بھی نظر نہیں آتا۔ عام متوسط طبقے کے فرد کی ہمت وہ ہمتِ مردانہ نہیں ہوتی جو زندان کو اپنی کمند سے

اسیر کرلے۔ جہدِ زندگی میں اُس کی کمند تو پہلے ہی ٹوٹ چکی ہوتی ہے۔

بات دور چلی جائے گی۔ غالب عرفان صاحب کے مجموعۂ کلام سے بات نکلی تھی۔ ''آگہی سزا ہوئی۔'' سو اس کا تجزیہ میں نے کرنا چاہا ہے، کیا آپ نے غور کیا کہ شاعری زیادہ تر متوسط طبقے کا شغل ہوتا ہے۔ میں نے سرداروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اولادوں کو اس شغل میں کم ہی اُلجھتے دیکھا ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ زندگی کا بہاؤ جب رکاوٹ سے دوچار ہوتا ہے تو کرب کی کیفیت شاعری بن جاتی ہے۔ (شاید یہ سب سے آسان راستہ ہے) اور اس سے نبرد آزما ہونے کا طریقہ موضوعی، دماغی نظام کا ایک حصار ہے، جو شاعر اپنی ذات کے چاروں طرف بُن لیتا ہے۔

مرے جسم و جاں سے نکلی تو فصیل بن گئی ہے
مری آرزو کی خوشبو مرے شہر ماورا میں!!
میں وجود ہوں تو مجھ کو نہ بکھرنے دینا ورنہ
مجھے ڈھونڈنا پڑے گا کسی حرف کی صدا میں

میں غالب عرفان صاحب کی شاعری کا تجزیہ کسی تنقیدی نظر سے نہیں کرسکتا اور نہ چاہتا ہوں۔ یوں بھی آج کل کے نظریات سے بات واضح ہونے کے بجائے پُرپیچ بلکہ مہمل ہو جاتی ہے۔ ساختیات، پس ساختیات، جدید نظریے، تحلیل نفسی، ڈسکورس کے دائرے، غرض ان میں ہر لسانی نظریے کو آپ ہر تحریر پر چاہے وہ ادبی ہو، یا نہ ہو، مسلط کرسکتے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ اُس سے جو بات ثابت ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ادب اور شاعری، زبان کے ایک کلی نقطۂ نظر کے تابع ہے، اور قاری پھر بھی یہ کہہ سکتا ہے ''کیا ہوا'' پھر یہ تمام نظریات ایک خاص تہذیبی ثقافت کی پیداوار ہیں، اور فلسفیانہ تگ و تاز کے ایک خاص ماحول کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مغربی معاشرہ صنعتی انقلاب کے بعد جس تیزی سے بدلا۔ اُس سے زیادہ تیزی سے پس صنعتی دور میں تبدیلیاں واقع ہورہی ہیں۔ مابعد الطبیعاتی نظاموں، آئیڈیالاجیوں اور کلی فلسفوں نے بیسویں صدی میں ایک نئی فکر کا سامنا کیا ہے، یہ نئی فکر ہر کلی نظام، ہر آئیڈیالوجی اور ہر مابعد الطبیعاتی فکر کی شکست و ریخت

میں مصروف ہے، اور زندگی اور اُس کے مظاہر کو کبھی لسانی اور کبھی جنسی نظام کی عینک سے دیکھتی ہے۔ مشرق میں اور خاص طور پر جنوبی ایشیا کی تہذیبوں میں فکر کئی سو سال سے منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ یہاں کارتیسی مابعد الطبیعاتی (CARTESIAN METAPHYSICS) نے جنم لیا۔ نہ صنعتی انقلاب آیا، نہ جدیدیت پیدا ہوئی۔ اور نہ ساختیات کے نظریات نے جنم لیا۔ اس لیے اس تہذیبی پس منظر میں کسی ادبی تخلیق کو تنقید کے اُن اصولوں سے پرکھنا جو ایک دوسری تہذیبی فکر کی پیداوار ہوں کس طرح ممکن ہے؟

غالب عرفان کی شاعری اسی ماحول کی پیدا کردہ ہے۔ اسی معاشرے کے دُکھ سکھ کا عکس ہے، اور اسی کی آرزوؤں کی آئینہ دار!

میں صحرا میں سمندر دیکھتا ہوں
کبھی جو اپنے اندر دیکھتا ہوں!
اک آئینے میں میرا عکس ہے اور
مقابل جسم پتھر کا دیکھتا ہوں!
اک پرندہ اُدھر بلندی پر!
اور اِدھر تیر اک کمان میں ہے
اک نئی روشنی کا اِذنِ سفر
آمدِ صبح کی اذان میں ہے!

اگر ایک طرف ان میں حالات کی ستیزہ کاری اور تاریخ کے جبر کا اظہار ہے۔

عہدِ گم گشتہ کی نسلوں نے جو بویا تھا وہ زہر
آج اس وقت قریبِ رگِ جاں کتنا ہے

تو دوسری طرف، اگرچہ شاذ ہی، وہم و گمان سے نکل کر یقین کی منزل کی جانب پیش قدمی کی سعی بھی ہے۔

یقیں کے اس سفر میں مجھ سے پہلے
بجز وہم و گماں کوئی نہیں تھا!

مجموعی طور پر غالب عرفان کی شاعری پر یاسیت کا تاثر غالب ہے لیکن یہ اس دُکھ سے ملتی جلتی ہے جس کے بغیر آدمی کا انسان بننا ممکن نہیں ہوتا۔ دُکھ کا یہ راستہ انسان کو اپنی ذات کے حصار سے نکال کر اس مابعد الطبیعاتی دکھ میں شریک و سہیم کرتا ہے جو بالآخر انسان کو دکھ سکھ سے بے نیاز کر دیتا ہے اور اس کے اعمال کے محرکات کو نفسی اور ذاتی حد سے نکال کر ماورائی بنا دیتا ہے' اور مئے انگبیں کی لاگ اور دوزخ کے ڈر دونوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا، کہ غالب عرفان اپنی شاعری کے ذریعے اس منزل تک پہنچ چکے ہیں، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ یہ سفر اگر جاری رہا تو یہی یاسیت ایک دن سود و زیاں کے چکر سے نکل کر آفاقی احساس میں تبدیل ہو جائے گی۔

ڈاکٹر منظور احمد

۱۴۔دسمبر ۱۹۹۲ء (وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی)

☆☆☆

ماورا کے منظروں کا شاعر

غالب عرفان سے مل کر جو شخصی تاثر مرتب ہوتا ہے اس میں متانت، سنجیدگی اور شائستہ لب و لہجہ نمایاں ہیں۔ فکر و عمل میں ایک ذمہ دارانہ رویہ اور معاملات کو صحیح طور پر سمجھنے کی جستجو کا اظہار ملتا ہے۔ آج کے دور میں جب انسان سفاکانہ حد تک خود نگر ہو کر رہ گیا ہے اور ہر ایک نے اپنی الگ دنیا بسالی ہے ایسے لوگ جو اپنا دل کشادہ رکھتے ہوں اور سب کے دکھ درد کو اپنا دکھ جانتے ہوں کم ہیں۔ غالب عرفان کی شخصیت کے یہ پہلو اس کی ذات کے اشاریے کو قابلِ قدر طور پر ترتیب دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک خوش کن بات ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اگر غالب عرفان کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہ مسرت دوچند ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ غالب عرفان کا فکری رویہ، طرزِ احساس اور شعری عمل تخلیق کے انہی شخصی اور ذاتی اوصاف کا پرتو ہیں جس کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے۔

شاعری الفاظ کی میکانکی تعمیر و تربیت کا نام نہیں ہے۔ میکانکی عمل شعر کے جسمانی خدوخال کی تخلیق تو کر سکتا ہے مگر اس میں سچی معنویت کی روح نہیں پھونک سکتا۔ سو شاعر کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اعلیٰ ترین حسی جوہر رکھتا ہو بلکہ زندگی کے داخلی اور خارجی عوامل میں پوری مستعدی کے ساتھ شریک بھی ہو۔ زندگی کے تمام گوشے اس کی نگاہ میں ہوں اور وہ معاشی، معاشرتی اور سماجی سطح پر فرد و افراد کے عمل اور اشتراکِ عمل کا جائزہ گر بن سکے جو بیک وقت زمان و مکاں، ماضی، حال و مستقبل اور ان میں پھیلے ہوئے انسانی رشتوں کی سچی تفہیم کر سکتا ہو۔ غالب عرفان کی شاعری میں اس سارے عمل کی نمایاں خواہش بھی ہے اور کاوش بھی۔

غالب عرفان کے مجموعہ کلام ''آگہی سزا ہوئی'' میں ایک شعری کینوس پر سانس لیتی ہوئی زندگی کی تصویر دیکھ سکیں گے لیکن اگر آپ تہہ داریوں کے اندر جھانک کر دیکھ سکتے ہوں تو آپ کو ان اشعار کے پس منظر میں شاعر کے ذہن کی وہ باطنی کیفیات بھی نظر آ جائیں گی جس میں سچے جذبوں کی دھڑکن خلوص اور دردمندی کے بھی رنگ موجود ہوتے ہیں۔ زندگی کو دیکھنے' سمجھنے اور برتنے کے لیے استدلالی راہ سے الگ فرد کا ایک شخصی رویہ بھی ہو سکتا ہے اور اظہار کے قالب میں ڈھل کر یہی رویہ زندگی کی نیرنگیوں کی سمت اشارہ کرتا ہے۔ کبھی زندگی کا یہ سفر ایک نہ ختم ہونے والے خطِ مستقیم پر جاری رہتا ہے اور کبھی دائرہ در دائرہ زندگی کی کٹھنائیوں اور گھٹن کا احساس بن جاتا ہے۔ غالب عرفان نے بعض ایسے ہی مقامات کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

زندگی صرف نظر ہے دائرہ در دائرہ
یا مسلسل اک سفر ہے دائرہ در دائرہ
مجھ کو اس کے پاس لے جاتا ہے جو وہ راستہ
ایک ہی خط ہے مگر ہے دائرہ در دائرہ

مشاہدے اور جستجو کے لیے مقصد اور مقصدیت اوّلین اہمیت کے حامل ہیں۔ سفر سے پہلے منزل کا تصور اور منزل کو پالینے کی آرزو سے دل معمور ہونا چاہیے۔ اسی طرح زندگی کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ طے پا جانا چاہیے کہ اسے کس حوالے سے سمجھا جائے۔ کھڑکی کے پٹ اندر کی جانب بھی کھل

سکتے ہیں اور باہر کی جانب بھی۔ یہ حوالہ ذات کا بھی ہوسکتا ہے اور اس سے ماورا کا بھی۔ غالب عرفان کا نقطۂ نظر یہاں بھی صاف اور واضح ہے۔ وہ حصارِ ذات میں رہتے ہوئے ماورا کے سارے منظر دیکھ لینا چاہتے ہیں۔

دیکھنا ہے اس حصارِ ذات سے
سارا منظر ذات کے اس پار کا

ذات کے حصار سے اس پار کا منظر دیکھنا سہل نہیں ہے۔ انسانی نفسیاتی ضابطے مزاحمت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم اپنی ذاتی خوشیوں، ذاتی غم اور ذاتی آسودگی و ناآسودگی سے الگ ہوکر نہ سوچ پائیں۔ حصارِ ذات سے اس پار کا منظر تو دوسروں کی زندگی ہے۔ ان کی خوشیاں، ان کے غم، ان کا پیار، ان کی نفرت، ان کا جینا اور ان کا مرنا یہاں یہ بات سمجھ لینا آسان ہوجاتا ہے کہ دوسروں کے احساسات کو اپنی ذات میں سمو لینا اور ان کا اظہار کرنا شاعر کے مثبت فکری رویّہ کی نشان دہی کرتا ہے۔ شاید اسی طرزِ احساس کے نتیجے میں غالب عرفان نے یہ اشعار کہے ہیں۔

بھنور میں ڈوب گئے ہم مگر وہ سانس کے تار
جو ساحلوں پہ بھی کچھ نقشِ آب لکھتے رہے
کوئی بھی نہ بچ سکا جشنِ فتح کے لئے
شہر کی فصیل پر طبلِ جنگ رہ گیا
تاریخ کے دوراہے پہ تہذیب کے ہاتھوں
انسان کو اتنا کبھی ششدر نہیں دیکھا
حصارِ نیم شبی سے نکل رہا ہوں میں
طلوعِ صبح کا منظر مری تلاش میں ہے
سُرخ آندھی بن گئی ہے سارے منظر کی ہوا
آنکھ میں چبھنے لگی ہے اب سمندر کی ہوا
آگ پھیلی اور بستی راکھ بن کر رہ گئی
کچھ تھا موسم کا تقاضا کچھ مقدر کی ہوا

سفر کی آخری منزل پہ لٹ کر
متاعِ زندگانی بولتی ہے
جبینوں پر شکن کی تہہ میں اکثر
دلوں کی بدگمانی بولتی ہے
یقیں کی صف میں دکھائی دیا بہ شکلِ گماں
اذیتوں کا وہ چہرہ جو دل کے گھاؤ میں ہے
طلب رسد کے معاشرے میں یہی ہے آئین کارفرما
تباہیوں کے معاوضے پر شعور کو یرغمال رکھنا
کون کس کو راہ دکھلائے انا کے دشت میں
کب حصارِ ذات سے باہر نکل پاتے ہیں لوگ
سکوت ہوگا کہ محشر بپا کسے معلوم
فضا میں ابھری ہوئی جب یہ تان ٹوٹے گی
قاتل تو قتل گاہ سے ہوتے گئے فرار
الزام چشمِ دید گواہوں کے سر گئے
سچ کے ہر آئینہ خانے میں قدم رکھنا ہے
ہم جو زندہ ہیں تو ہونے کا بھرم رکھنا ہے

یہ اشعار جن کی نشاندہی یہاں کی گئی ہے ہمارے اپنے شب و روز اور ہمارے اطراف پھیلی ہوئی زندگی کا سیاسی، سماجی اور معاشرتی منظرنامہ بھی ہیں۔ ان میں لمحۂ موجود کے حوالے سے زندگی کے سارے اختیار اور بے اختیاریاں رقم کردی گئی ہیں۔ فتح کا جشن دیکھنے کے لیے صرف طبلِ جنگ کا بج رہنا۔ تاریخ کے دوراہے پر انسان کا حیران و پریشان، بے آسرا ششدر کھڑے رہنا، سفر کی آخری منزل پر متاعِ زندگی کی نوحہ خوانی، شکن آلود ذہنوں پر دل کی بدگمانیوں کی تحریریں، طلب رسد کے بے اخلاق معاشرے میں یرغمالی شعور کی بے بسی، قاتل آزاد اور چشمِ دید گواہوں پہ قتل کا الزام۔ یہ دراصل آج کے معاشرے کی افراتفری اور بے انصافیوں کی داستان ہے۔

غالب عرفان اپنے عہد اور عصرِ حاضر میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں اس کی ایک اچھی تفسیر ان کی شاعری کا نمایاں حصہ ہے وہ اعتماد اور یقین کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔

وہم کا شعور سے ربط ہو تو ہو مگر
دل کا ہر معاملہ ہے یقین کے لئے

یہ ذہن و دل کے تقاضوں کے مختلف محور
یہ خواہشیں ہیں کہ مجبوریاں کسے معلوم

یہ زمیں تنگ ہوتی جاتی ہے
اب خلا کی پناہ باقی ہے

جدید ذہن کا آئینہ میرے ہاتھوں میں
قدیم دور کا پتھر مری تلاش میں ہے

منتشر کرتی ہے شیرازہ کتاب ربط کا
گھر کے اندر رقص کرتی ہے جو باہر کی ہوا

ہے آشنائی کسی موج سے نہ ساحل سے
مگر سفینے کا ہر فرد ناخدا ہے یہاں

زندگی کے بدلتے ہوئے تیور اور روایتوں کی تہذیب سے انحراف کرتے ہوئے نئے فکری رویے معاشرے میں شکست و ریخت اور بکھرتی ہوئی تہذیبی اقدار ہمیشہ صاحب فکر اور دل درد مند رکھنے والوں کے لیے ذہنی اور فکری اذیت کا سبب بنتے ہیں۔ ایسے میں یوں بھی ہو سکتا ہے کہ انسان ثبات کھو دے اور زندگی سے ہار مان جائے۔ مگر غالب عرفان تمام تر کرب و جاں سوزی کے باوجود ایک حوصلہ مندانہ جذبہ بھی رکھتے ہیں اور یہ یقین بھی، کہ حالات بدل سکتے ہیں۔ ان کی آرزومندی ہر دم نئے پیکر میں ڈھلتی جاتی ہے اور وہ جبرِ وقت اور کارِ جہاں کی گہما گہمی میں ایک فزوں سے فزوں تر ہوتی ہوئی لگن کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔

منقلب ہونے تو دو دل کو زمانے کے لیے
چہرہ چہرہ نئے منظر سے نکھر جائے گا

ساحلوں کا مزاج پوچھے گی
لہر اٹھنے تو دو سمندر سے
دلوں کا ربط ہی چہروں کو تازگی دے گا
چھٹے گا جونہی نگاہوں سے مصلحت کا غبار
مدتوں سے بے یقینی کی فضائے منتظر
لمحہ لمحہ چاہتی ہے اعتبار زندگی
سمٹتا جائے گا طاقت کی سرکشی کا نظام
ہوا کی آن سر بادبان ٹوٹے گی
سکوتِ شب کی سیاہ لہروں میں ایک وحشت چھپی ہے لیکن
ہوا کی سرگوشیوں میں پنہاں نئی سحر کی اذان بھی ہے
عرفانِ حقیقت کا تقاضا ہے کہ انساں
ہر فاصلۂ وقت سے آگے نکل آئے

وارفتگی اور والہانہ جذبات شعر میں دل پذیری کا رنگ ضرور بھرتے ہیں اور شعر میں آہنگِ نغمہ فکر کے بعض نایافتہ گوشوں تک حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پہنچ بھی جاتا ہے تاہم اعلیٰ ترین سچ کے لیے جو شاعری کا مقصودِ اوّل ہے زندگی کے عوامل کا مطالعہ و مشاہدہ بقید ہوش و حواس ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس عمل کی ترجمانی غالب عرفان کے یہ اشعار بخوبی کرتے نظر آتے ہیں۔

نگاہوں کی کہانی لکھتے رہنا
زباں کی بے زبانی لکھتے رہنا
بلندی اور پستی سے گذر کر
کتابِ زندگانی لکھتے رہنا

میسر ہو اگر خود احتسابی
یقیں کی بدگمانی لکھتے رہنا
روایت کو نیا آہنگ دے کر
نئے حرف و معنی لکھتے رہنا

غالب عرفان نے آگہی کو سزا جانا ہے اور تجربے میں جس بلا کی صداقت ہے اس کا اظہار ان کی تمام شاعری میں دائرہ در دائرہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ ایک آگہی تو وہ ہے جو نہ معلوم سے معلوم کی جانب سفرِ تمنا کی آخری منزل ہے یہ سفر نشاطِ کار کی راہوں سے گذرتا ہوا طمانیت کے وادی میں جا پہنچتا ہے لیکن غالب عرفان کے لیے جو آگہی سزا ہوئی ہے وہ معلوم سے معلوم کے درمیان امکانات کے دشت میں سفر کرتی ہے۔ یہ آگہی بہت سفاک ہے۔ اس کے ہاتھوں زخم کھا کر بے خبری انجانی حسرتوں کی شکل میں یاد آجاتی ہے اور ایک حساس دل رئیس امروہوی کے الفاظ میں کہہ اٹھتا ہے۔

مرے قریب نہ آ، اے! بہشت بے خبری
کہ آگہی کے جہنم میں جل رہا ہوں میں

اس آگہی کے جہنم میں نہ جانے کتنے ہی حساس لوگ جل گئے، جل رہے ہیں یا جلتے رہیں گے۔ رئیس امروہوی سے غالب عرفان تک، مگر ان سے پہلے بھی اور آئندہ بھی!

غالب عرفان کی شاعری کے اس تجزیے میں ابھی بہت سی باتیں اَن کہی رہ گئی ہیں۔ ان کی لغتِ شعری، اندازِ بیاں، شعریت اور جمالیاتی پہلو پر بھی اظہار خیال ہو سکتا ہے مگر یہ تفصیل طلب ہے۔ یہ چند تاثراتی پیراگرافس جو غالب عرفان کے مجموعۂ کلام "آگہی سزا ہوئی" پر لکھ دیے گئے ہیں ایک خاص سمت اشارہ کرتے ہیں اور ان کے کلام کی کئی خوبیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ایک خوش مقصدیت جو ان کے کلام میں جاری و ساری ہے۔ انھیں اپنے ہم عصروں میں نمایاں کرتی ہے۔ غالب عرفان اس آگہی پر خوش ہوں مگر مطمئن نہ ہوں تو اچھا ہے!!

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کراچی یونیورسٹی۔ پاکستان

جنوری ۱۹۹۳ء

ایک خود آگاہ شاعر

غالب عرفان گذشتہ کم وبیش پچیس برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اہلِ نقد ونظر کے نزدیک یہ عرصہ کسی بھی نئی آواز کو پہچاننے اور اس کے مرتبے کو جاننے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بیشتر لکھنے والوں کی طرح غالب عرفان کا بھی یہی المیہ ہے کہ ادبی گروہ بندیوں کی وجہ سے ان کی شاعری کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ یہ ان کا حوصلہ اور کارِ تخلیق سے لگن ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ مایوسی کا شکار نہیں ہوئے۔ اس پوری صورتحال کو انہوں نے مثبت سوچ کے ساتھ کس خوبصورتی سے ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

کچھ ہوا بھی تیز تھی، کچھ بکھر گئی تھی خاک
دیکھنا محال تھا ناقدین کے لیے

اس رجائی اندازِ نظر کا نتیجہ ہے کہ وہ آج بھی تازہ دم ہیں اور اپنی تقریباً ربع صدی کی تخلیقات کا انتخاب ''آگہی سزا ہوئی'' کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔ غالب عرفان کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ غزل کے جدید تقاضوں اور عصری حسیت سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ویسے انہوں نے غزل کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا صحیح میدان غزل ہی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ غزل کے جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب عرفان کہیں بھی زبان، فن یا غزل کی روایت سے بغاوت کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ غزل کو انہوں نے تہذیبی ورثے کے طور پر قبول کیا ہے۔ اسے اپنے شعور کی آنچ سے تب وتاب دی ہے اور آج کی نفسیات کو برت کر غزل کہنے کے منصب سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اس تمام عمل سے گذرتے ہوئے انہوں نے نئی بات کہنے کی بھی کاوش کی ہے۔ بعض اوقات انہوں نے غزل کے کلاسیکی مضامین کو اپنے رنگ اور اپنے آہنگ میں بڑے ڈھنگ سے ادا کیا ہے۔ ان کے یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

گزرا لمحہ تو نہیں ہوں کہ پلٹ بھی نہ سکوں
یاد کی شمع ہوں جب چاہے جلا لو مجھ کو

کل کی یادوں کا سہی ہوں تو حسیں تاج محل
تابکاری کے دھماکوں سے بچالو مجھ کو
جسم و جاں کا ربط بھی کیا فاصلوں کا ربط ہے
دو کنارے جیسے ہوں بہتی ندی کے آس پاس
طے شدہ راہوں میں تشنہ کامیاں ملتی رہیں
منزلِ مقصود پائی گرہی کے آس پاس
ہر مسئلۂ وقت کی شدت کو بھلانے
تقریر سے بہلانے کا فن یاد رہے گا
ہے اک وجود کہ خوابِ رواں کسے معلوم
سفر میں، میں ہوں کہ نظمِ جہاں کسے معلوم

ان اشعار میں ہر چند کہ وہ اپنے سے سینئر شعراء اور متقدمین سے متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن انہوں نے آج کے تناظر میں اپنے مشاہدے کا نیا رنگ دے کر ان مضامین کو جلا بخش دی ہے۔ انہوں نے معذرت خواہانہ انداز اپنانے کے بجائے دوٹوک انداز میں کہا ہے۔

روایت کو نیا آہنگ دے کر
نئے حرف و معنی لکھتے رہنا

ہر فنکار اور تخلیق کار اپنے ابتدائی دور میں اپنے ہم عصروں اور متقدمین سے متاثر ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اپنے لہجے اور اپنے اندازِ فکر سے اپنی پہچان کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ بات میں نے ایک کلیشے کے طور پر نہیں بلکہ ایک پروسس (PROCESS) کے طور پر کہی ہے۔

آج سے تیس پینتیس برس پہلے ظفر اقبال نے غزل میں نئی لفظیات لانے کی کوشش کی تھی۔ جس پر اس وقت کے نقاد خاصے برافروختہ ہوئے تھے۔ ظفر اقبال نے غزل میں پہلی دفعہ شعوری طور پر انگریزی اور ٹھیٹ اُردو کے الفاظ برت کر غزل کے ڈکشن کو نئے امکانات سے روشناس کرایا تھا۔ اس شعوری عمل سے گزرتے ہوئے بعض اوقات نئے اور غیر مانوس الفاظ سے ان کے اشعار مضحکہ خیز صورت اختیار کر گئے لیکن پہلی کوشش میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ ان کے بعد شہزاد احمد، الیاس عشقی، انجم اعظمی، محمود شام، عالمتاب

تشنہ اور بعض دیگر شعراء نے اپنی غزلوں میں نئے لفظیات کو جگہ دی (نظم میں یہ اجتہاد کافی پہلے راہ پا چکا تھا) غالب عرفان کے زیرِ نظر مجموعے میں بھی آپ کو جا بجا ایسے اشعار نظر آئیں گے جو صرف چونکانے یا متوجہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی بات کو حال کے پس منظر میں قاری تک پہنچانے کے لیے کہے گئے ہیں اور وہ بھی غزل کے خوبصورت پیرائے ہیں۔

دریچہ کوئی تو گھر کا کھلا رہے ورنہ
وہ خط تو ڈاکیہ باہر کہیں گرا دے گا
جھونکا ہوا کا دھول نگاہوں میں بھر گیا
دروازہ کھولنے کا صلہ پا رہا ہوں
اپنے البم میں یہ تصویر پڑی رہنے دو
عہدِ گم گشتہ ہوں تاریخ بنا لو مجھ کو
جل رہا ہوں صبح کے امکان میں
بن کے انگارہ میں آتش دان میں

غالب عرفان نے گرد و پیش میں اپنے باطن کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

آئنہ میرے مقابل ہے مگر
میرا چہرہ نہیں ملتا مجھ سے
تلاش مجھ کو کیا کائنات نے میری
میرے سفر نے مجھے کو طور تک دیکھا
فاصلہ سمٹا تو قربت پر عیاں جو کچھ ہوا
وہ میری فکر و نظر کا زاویہ بنتا گیا

انہوں نے تحصیلِ ذات اور کرب دروں کے مراحل سے گزرتے ہوئے اپنے اردگرد جیتی جاگتی دنیا اور اپنے ماحول کے تقاضوں سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ حقائق کی ترجمانی کی ہے اور واشگاف الفاظ میں احتجاج بھی کیا ہے۔ اس طرح ان کا لہجہ تلخ ضرور ہو گیا ہے لیکن

شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

کوئی بھی نہ بچ سکا جشن فتح کے لیے
شہر کی فصیل پر طبلِ جنگ رہ گیا
آگ پھیلی اور بستی راکھ بن کر رہ گئی
کچھ تھا موسم کا تقاضا کچھ مقدر کی ہوا

آخر میں چند ایسے اشعار جنہیں میں غالب عرفان کی پہچان سمجھتا ہوں۔

ذرا سا ہنس کے مروت سے بات کر لینا
مجھے یقین ہے وہ تلخیاں بھلا دے گا
میں سر خمیدہ ملوں تو بھی مصلحت جانیں
مرے بزرگ مری سرکشی سے ڈرتے ہیں
تہذیب کے بہاؤ پہ چھوڑی ہے زندگی
تاریخ کے اصول کو اپنا رہا ہوں میں
یہ گھر، یہ زمیں، میری زباں، میرا تشخص
یہ زہر چڑھا ہے جو اتر کیوں نہیں جاتا
چہرے نے اتنے سوانگ رچائے ہیں روز روز
لگتا ہے اپنا نام بھی نا آشنا مجھے
مرے وجود میں پنہاں کئی زمانے ہیں
مری نظر کے مقابل ہے اک کھنڈر کی شام
فصیلِ جسم سے باہر سفر طویل سہی
خود اپنی ذات کے اندر حصار کتنا ہے

یہ اور ایسے متعدد اشعار آپ کو اس مجموعے میں جا بجا ملیں گے۔ جو آپ کی توجہ کو دعوت تامل دیں گے۔ میرے خیال میں تخلیق کا یہی جوہر ہے جس کے لیے تخلیق کار شب و روز اپنا خونِ جگر صرف کر رہے ہیں اور ان ہی تخلیق کاروں کی صف میں غالب عرفان بھی ہیں۔ جو ستائش کی

تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اس راہِ پُر خار پر ہر قدم آگے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

محسن بھوپالی

۲۲ر اپریل ۱۹۹۲ء

غالب عرفانؔ کون؟

غالب عرفانؔ بحیثیت شاعر کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔وہ ہندوستان میں بھی جانا پہچانا جاتا ہے اور پاکستان میں بھی۔ پاک و ہند کے مختلف رسالوں میں اس کا نام گذشتہ دو دہائیوں سے تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا آرہا ہے۔

غالب عرفانؔ کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ یہ حیدرآباد نہیں۔ وہ حیدرآباد جس کے بارے میں ناجیؔ نے کہا تھا۔

محبت سوں علی کی دیکھ ناجیؔ
ہوا ہے دل میرا اب حیدرآباد

جبکہ اس کی تعلیم و تربیت صوبہ بہار کے انتہائی جنوب میں واقع مشہور صنعتی شہر جمشید پور میں ہوئی۔ وہیں سے گریجویشن کیا۔ اُردو اس کی مادری زبان ہے۔ انگریزی پر اس کی گرفت مضبوط ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہندی بھی جانتا ہے بلکہ ہندی کے لفظوں کو ان کے صحیح تلفظ سے ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ جمشید پور سے وہ سابقہ مشرقی پاکستان کے ساحلی شہر چٹاگانگ چلا گیا وہیں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ بنگال میں قیام کے دوران اس نے بنگالی بھی سیکھ لی اور بہت جلد اس پر عبور بھی حاصل کر لیا۔

حیدرآباد دکن سے صوبۂ بہار پھر صوبۂ بنگال اور اب صوبۂ سندھ تک کے سفر میں بلکہ سفر بہ رنگِ سفر میں غالب عرفانؔ کی زبان، اس کی فکر، اس کے دھارے اور اس کے جذبات واحساسات نے کہاں کہاں اور کب کب پہلو تبدیل کئے ہوں گے، ایک رنگ کے بعد دوسرے رنگ کے اُبھرنے اور اس کو اُبھارنے میں کتنا خونِ جگر صرف ہوا ہوگا اور وہ بذاتِ خود کس کس مقام سے کبھی تنہا اور کبھی سب کو ساتھ لے کر چلا ہوگا، اس سارے سوالوں کا جواب شاعری کا ایک سنجیدہ قاری اگر ضروری سمجھے تو اس کے مجموعہ میں آسانی سے تلاش کر سکتا ہے۔ یہ سفر جو اس نے طے کیا، جسے عام طور سے لوگ ہجرت کا سفر کہتے ہیں جبکہ میں اسے محبت کا سفر کہتا ہوں، اس سفر میں

سب سے پہلے غالب عرفان نے اپنے اجداد کی بوسیدہ ہڈیوں کو ہندوستان کی خاک کے سپرد کیا اور آسودہ ہوگیا۔ محبت ایثار طلب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آباؤ اجداد کی ہڈیوں سے بڑا ایثار شاید کوئی اور نہیں اس کے بعد محبت کے اس سفر میں جب وہ مشرقی پاکستان میں آیا تو وہاں اس نے اپنے ایک بھائی کے خون کا نذرانہ پیش کیا۔

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

میں سوچتا ہوں کہ جب خدا کی اس زمین پر کوئی کسی آدمی کا قتل کرتا ہے تو آسمان پر کیسی چیخیں بلند ہوتی ہوں گی!

غالب عرفان ایک "آگ" کے دریا کو تیر کر آیا ہے۔ جب محبت کے مسافروں کے لیے سفر کے ایسے خطوط کھینچ دیے جائیں تو زندگی اور شاعری کے سلسلے میں بہت سارے اہم سوالات کی افادیت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر پھر بھی کوئی زندگی میں شرافت اور شاعری دونوں کو تھام کے رکھتا ہے تو ایسے لوگوں اور ایسے شاعروں کو میں سلام کرتا ہوں۔ انھیں لوگوں میں ایک بزرگ کا نام اقبال عظیم کا ہے اور نئی نسل میں دوسرا پیار بھرا نام غالب عرفان کا ہے۔

غالب عرفان کا خیال ہے کہ میں نے اسے سب سے زیادہ سُنا اور سمجھا ہے۔ میرے لیے سُننے سمجھنے کا مسئلہ نہیں۔ میں غالب عرفان کو جانتا ہوں۔ بیس برسوں سے اسے دیکھ رہا، اُسے سُن رہا ہوں۔ میں یہاں اس کی شاعری پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ اس کی کتاب میں پنجاب سے ڈاکٹر وزیر آغا اور کراچی سے کئی صاحبِ رائے حضرات کی آراء موجود ہیں۔ غالب عرفان کے قاری کے لیے وہ کافی ہو سکتی ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مشرقی پاکستان سے شاعروں اور ادیبوں کی جو کھیپ یہاں آئی ان میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے نام ہیں۔ انھیں میں ایک نام غالب عرفان کا بھی ہے جو اُن میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ جس کا اصل سبب تو یہ ہے کہ اوّل تو وہ ایک "صاحبِ طرز شاعر" ہے اور دوسرے یہ کہ وہ بغیر کسی بیساکھی کے چلتا ہے۔ اس کا کوئی ٹولہ نہیں ہے۔

یہ فلیپ غالب عرفان نے مجھے تعارف لکھنے کو دیا ہے میں کسی تصنع یا تکلف کا قائل نہیں ہوں۔ تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ شاعری ہی شاعر کا بہترین تعارف ہوتی ہے۔ غالب عرفان اگر مطمئن نہیں ہے تو یہ اس کے حق میں اچھی بات ہے۔ ویسے میں اُس سے مطمئن ہوں کہ اُس نے شعر لکھ دیا' ایک نہیں بلکہ کئی شعر' زندہ رہنے والے شعر اور اسے زندہ رکھنے والے شعر۔

کوئی بھی نہ بچ سکا جشنِ فتح کے لیے
شہر کی فصیل پر طبلِ جنگ رہ گیا

یہ شعر غالب عرفان کے نام کو زندہ رکھے گا۔ یہ زندہ شعر جب آپ غالب عرفان کی کتاب میں تلاش کریں گے تو جگہ جگہ اس قبیل کے اور معیار کے اور بھی کئی اشعار آپ کے دامن کو تھام لیں گے۔ ملاحظہ فرمایئے "آ گہی سزا ہوئی"۔

ثناء گورکھپوری

۲۷راگست ۱۹۹۴ء

اظہارِ رائے: (آ گہی سزا ہوئی)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

سچی شاعری عرفان و آ گہی پرمبنی ہوتی ہے اور یہ وصف غالب عرفان کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی شاعری معمولی شاعری نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے ایسے لوگ بھی خاموش نہیں رہتے بلکہ ان کے اندر بیٹھا ہوا شاعر حالات کی کٹھنائیوں میں انہیں خاموش نہیں رہنے دیتا اور شعر کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو صرف شعر کہنے کے لیے شاعری نہیں کرتے بلکہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کے مناظر کو اپنا مخصوص انداز بیان عطا کرتے ہیں اور تاریخ میں زندہ رہ جاتے ہیں کیونکہ شرافت اور سچائی ان کا خاصہ ہوتی ہے۔ "آ گہی سزا ہوئی" میں ان کی اپنی تحریر سے ان کی شخصیت اور ان کے مزاج میں دوسروں کے احترام اور محبت کے عنصر کا ثبوت بھی ملتا ہے انہوں نے اپنے ماضی کی ہر اس شخصیت کا ذکر کیا جنہیں لوگ بھول جاتے ہیں اور یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔ (۱۵/دسمبر ۱۹۹۴ء)

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی

آپ کی شاعری میں تجربے کی گرمی اور احساس کی تازگی ہے آپ نے بعض شگفتہ زمینیں بھی استعمال کی ہیں اور کامیاب رہے ہیں۔ آپ کا فکری سفر آپ کے کلام کے لیے طویل پس منظر کا کام کرتا ہے۔ (۳۱/جون ۱۹۹۶)

حکیم محمد سعید، کراچی

انہوں نے اپنی فکر کو روایتی سوچ تک محدود نہیں رکھا ہے۔ جدید فکر کو اپناتے ہوئے حیات و

کائنات کے بارے میں جدید نظریات کو اپنی شاعری میں ڈھالا ہے۔ان کی شاعری عہدِ حاضر کے اجتماعی مزاج سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔(۱۰/جنوری ۱۹۹۴ء)

ڈاکٹر عاصی کرنالی۔ملتان

غالب عرفان نے اس انداز کی اہم، با معنی اور مقصدی شاعری کر کے اور پورے عرفان و بصیرت اور عصری حسیت کے ساتھ ہمارے احوال و مسائل اور آلام و حوادث کا بھرپور احاطہ کر کے جہاں ایک طرف شاعری کے سفر کو ایک نیا موڑ دیا ہے وہیں ہم اہلِ فکر اور اہلِ قلم کو آئینہ دکھایا ہے کہ ہمیں آج کے زمانے میں اس طرزِ احساس کی شاعری کرنی چاہیے۔(ماہنامہ سخنور کراچی، مارچ ۱۹۹۹ء)

محمد فیروز شاہ، میانوالی:

یہ غالب عرفان کا تخلیقی ہنر ہے کہ اس نے اپنے دکھ کو ایسی پُر تاثیر زبان عطا کی ہے کہ وہ قارئین کے سکھ کا سامان فراہم کر رہی ہے۔ایسا غم گسار سکھ جو صرف کسی ہمدم آوازی کا اعزاز ہوا کرتا ہے۔

وزیری پانی پتی، کراچی:

یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے ان کا لہجہ حجم اختیار کرتا جا رہا ہے اور اسلوب میں نکھار پیدا ہو رہا ہے۔مجھے امید ہے کہ وہ دنیائے شعر و ادب کی ان تمام توقعات کو پورا کریں گے جو "آگہی سزا ہوئی" کے مطالعے سے پیدا ہوں گی۔

ڈاکٹر پروفیسر فاروق احمد:

یہ کتاب اس شاعری کی نمائندگی کر رہی ہے جس میں علم و عرفان کا سوز و ساز موجود ہے۔شاعر کا تخلیقی امیج دکھ کے گھنے جنگل کا سایہ اوڑھے ہوئے ہے لیکن یہ آواز شکست کی آواز نہیں ہے۔غالب عرفان بہت سلیقے سے غزل کہتے ہیں۔تاریکی سے نور کشید کرنے کا فن انہیں آتا ہے یہی وجہ ہے کہ "آگہی سزا ہوئی" نئی غزل کا ارفع اظہار بن گئی۔

(سہ ماہی "قلم قبیلہ" کوئٹہ)

عشرت رومانی، کراچی:

سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں احساس کی تہہ داری اور جذبوں کی سادگی ہے جس میں

لطافت کے ساتھ ساتھ اظہار کا حسن بھی ہے۔ ان کی کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جس میں لفظوں نے جادو جگائے ہیں اور طلسم کاری کی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ نغماتی سرگوشیاں کر رہے ہیں جیسے کہ خاموشی کے پردے میں بکھی آوازیں ہوں۔

(سہ ماہی سفیر اُردو، لیوٹن، برطانیہ)

پروفیسر غفار شاد، کراچی:

ان کی شاعری کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی فکری وسعتوں میں انتہائی قریب سے لے کر انتہائی دور تک کی حقیقتیں اجاگر ہیں۔

قطعہ تاریخ

تنویر پھول، کراچی

آگہی اب ہوگئی ہے اک سزا
جان کر تقدیر ہیں خاموش لب
پھولؔ نے تاریخ لکھی آج کی
غالب عرفاں وہ ہوئے رشک ادب

۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء

'نوائے وقت' کراچی:

ایک حساس قلب وشعور کے مالک خوبصورت شاعر نے واردات قلب ونظر، اردگرد بکھرے دکھ سکھ اور ہمارے انسانی معاشرے کے حقائق کو الفاظ کی لڑی میں پرودیا ہے۔

(نثار احمد اختر، ۹/ فروری ۱۹۹۵ء)

ماہنامہ 'سیارہ' لاہور:

فکری بالیدگی کے ساتھ ساتھ غالب عرفانؔ کے ہاں فنی شعور کی پختگی بھی شعروں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ الفاظ کی نشست وبرخواست، خوبصورت ترکیب صوت وآہنگ کا شعور اور تغزل اس کی غزل کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ (طارق ہاشمی، دسمبر ۱۹۹۴ء)

روزنامہ 'جسارت' کراچی:

غالب عرفانؔ کا شعری مواد اور اس کا لہجہ معاشرے میں ان کی اس حیثیت کی طرف اشارہ

کرتا ہے ورنہ بہت سے ذہین لوگ تو صرف (Observer) ہی بن کر رہ جاتے ہیں اور محض مشاہدے کی شدت سے شاعری میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو غالب عرفان کے کئی شعروں میں پیدا ہوئی ہے۔ یہ کیفیت وہ دیا ہے جس سے آئندہ بھی چراغ جلنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔
(۲./جنوری ۱۹۹۴ء)

ریڈیو پاکستان، کراچی:

غالب عرفان کا یہ مجموعہ پڑھ کر مجھے اس کی خود اعتمادی جرأت اور لہجے کی بیباکی کا احساس بھی ہوا اس کا لہجہ بیباک اور لفظیات میں عصرِ حاضر کے رجحانات کا پرتو بہت واضح ہے۔ وہ اپنے دور کی حقیقتوں سے پوری طرح آگاہ ہے اور ان سے عہدہ برا ہونے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ [آگہی سزا ہوئی] ہمارے عہد کے شعری رجحانات کا بڑا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔
(ڈاکٹر اسلم فرخی ۔ ۲۴/جنوری ۱۹۹۴ء)

روزنامہ 'سنگ میل' ملتان:

۱۹۹۳ء کی ایک قابلِ مطالعہ اور ناقابلِ فراموش کتاب۔ کوئی ایک غزل، کوئی ایک شعر اور کوئی ایک مصرع ایسا نہیں جو شاعر کے اندرون سے پورے علم کے بغیر اشاعت پذیر ہوا ہے۔ [آگہی سزا ہوئی] ایک الاؤ ہے جسے شاعر نے برف زار کے عین درمیان بھڑکایا ہوا ہے۔ (اقبال ارشد، ۱۸/دسمبر ۱۹۹۳ء)

'قومی زبان'۔ کراچی:

غالب عرفان کا ذوق شعری جمشید پور کی دین ہے ان کی شاعری چاٹگام میں پروان چڑھی رس پر کراچی میں آئی۔ چاٹگام کی سرکشیدہ زمین نے ان کی شاعری کو بہت کچھ دیا۔ غالب عرفان کی شاعری کا ایک امتیاز سرکشیدگی بھی ہے۔ ان کی شاعری کا دوسرا رنگ سقوطِ مشرقی پاکستان کا المیہ ہے جو وہاں سے آنے والے ہر شاعر کے ہاں اپنی جھلکیاں دکھلاتا ہے۔ اور ان کے کلام کو ایک انفرادیت بخشنے کا سبب بنتا ہے۔ غالب عرفان کے کلام کے مطالعے میں ان دونوں باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ (ادیب سہیل)

''اہم سنگِ میل''

نعتیہ کلام ''م'' اور غزلوں کے مجموعے ''آگہی سزا ہوئی'' کے شاعر غالب عرفان کا تازہ

مجموعۂ کلام "روشنی جلتی ہوئی" ان کے تخلیقی سفر کا اہم سنگِ میل ثابت ہوگا۔عرفان صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں کہ قلب گداز اور طبع موزوں کے حامل ہیں۔

اب غزل کا یہ عالم ہے کہ سینکڑوں شعراء کی طبع آزمائی کے باوجود، ردیف قافیہ کی وجہ سے غزل میں تازہ سخن کے برعکس بھرتی کے پیش پا افتادہ اشعار کہنے کی زیادہ سہولت ہے۔اس لیے بیشتر غزلیہ شاعری کلیشے کی شاعری نظر آتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صاحب ذوق شاعر تنگنائے غزل کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے خوبصورت اشعار سے کلام کو خوش رنگ گلدستہ میں تبدیل کر دیتا ہے اور یہی غالب عرفان نے کر دکھایا۔

عرفان کی غزل محض عشق و عاشقی پر مبنی کچے پکے جذبات کی غزل نہیں بلکہ ان کی غزل میں عرفان کے کنائے بھی ملتے ہیں، نام کی مناسبت سے یہ نہیں لکھا۔حقیقت یہ ہے کہ غالب عرفان کا شاعر ہونے کی وجہ سے اپنی غزل کو عرفانِ ذات کے استعارہ میں تبدیل کر دینے کے فنی رمزے سے آگاہ ہے۔اس لیے اس کی غزل لذت دیدہ و دل کے ساتھ فکر و آگہی کے نکات بھی اجاگر کرتی ہے۔

نوائے عرفاں کی لہر تھی یا صدائے دل نغمہ زن ہوئی تھی
کہ میں نے دشتِ گماں کے اندر خود اپنا سینہ فگار دیکھا

(ڈاکٹر سلیم اختر-لاہور)

روشنی جلتی ہوئی کا دیباچہ

"آگہی سزا ہوئی"

غالب عرفان آگہی کو سزا سمجھتے ہیں۔وہ سزا تو بہرحال ہے لیکن کیسی عجیب سزا ہے کہ جس کے ٹہوکوں سے ذات اور کائنات کے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں اور عرفان کی دھند آئینہ بینی سے آئینہ گری تک کے جملہ مراحل کو آنِ واحد میں طے کرتی جاتی ہے۔نئی اردو غزل کے لیے یہ ایک اچھی خبر ہے کہ وہ اب نئی شعری زبان کا منظر نامہ ہی مرتب نہیں کر رہی بلکہ "اندر" اور "باہر" کی گہرائیوں میں بھی اترنے لگی ہے غالب عرفان نے آئینہ بینی کے مرحلے میں خود شناسی کے زاویوں کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہوئے اس پراسرار لمحے کی طرف بھی اشارہ کیا جب آئینہ میں ابھرنے والا شاعر کا اپنا عکس بھی اس کے لیے ایک رکاوٹ بن جاتا ہے:۔

وہ میرا عکس ہے یا اک گماں کسے معلوم
ٹھہر گیا ہے کوئی درمیاں کسے معلوم

اس کے بعد آئینہ گری کا مرحلہ آیا جہاں شاعر اپنے تخلیقی عمل سے اشیاء اور مظاہر، چہروں اور سطحوں کو اس طور سے منتخب کرتا ہے کہ وہ اپنی گدلاہٹ، کھردراہٹ اور کرختگی کو تج کر اس ٹھہری ہوئی جھیل کی طرح شفاف ہو جاتے ہیں جو نہ صرف باہر کو منعکس کرتی ہے بلکہ اپنے اندر کو بھی سطح پر لا کر نظروں کے سامنے گویا چُن دیتی ہے۔ آگہی کا یہ مرحلہ نوعیت کے اعتبار سے معرفتِ ذات کا لمحہ ہے۔ جس میں شاعر ساری کائنات کو ایسے ایسے آئینے تبدیل کر دیتا ہے جو بیک وقت عکاس بھی ہوتا ہے اور عکس بھی یعنی جہاں اصل اور اس کے عکس کی دوئی تک باقی نہیں رہتی۔

آئینہ در آئینہ عکاس اک صورت کا عکس
منظرِ شام و سحر ہے دائرہ در دائرہ

غالب عرفان کے فکر و مشاہدہ کی گہرائی اس کے محسوسات کا ایک زاویہ ہے نہ کہ اس کے ذہنِ رسا کا کرشمہ اور شاعری کے حوالے سے یہی بات اُسے درکار بھی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی شاعری آئینے کی طرح شفاف، نازک اور تہہ دار نہ ہوتی بلکہ افکار کے بوجھ تلے پس کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہوتی۔
(ڈاکٹر وزیر آغا)

تازہ کار شاعر

غالب عرفان ایک تازہ کار شاعر ہے۔ اُن کی شاعری کسی مکتب کسی حلقے یا کسی تحریک کی پروردہ نہیں ہے، اسی لیے اس میں اِنجیکٹ کی ہوئی توانائی کے بجائے خود اعتمادی کی قوت ہے۔ وہ قدم جما جما کر اس دشوار گذار وادی میں آگے بڑھ رہا ہے اور اسلوب و آہنگ کے طلسم پر فتح پانے کے لیے "اسمِ اعظم" کی تلاش میں ہے۔

غالب عرفان کی کچھ سوچتی، کچھ گنگناتی ہوئی غزلوں کا یہ مجموعہ جس میں ٹمکتے ہوئے خیالات اور اسپارک دیتے ہوئے مصرعے جگہ جگہ دامنِ دل کو کھینچتے ہیں، ایک ایسے شاعر کی خود اعتمادی کا وسیلہ ہے جو اُردو غزل کو ممکنہ طور پر اور بھی بہت کچھ دے سکتا ہے۔

میں، جہاں پہ ڈوبتا رہا ہوں یہ اک پرند
منظرِ طلوعِ ماہتاب دیکھتا رہا

شبنم رومانی

سابقہ مجموعہ ہائے کلام پر

اہلِ نقد و نظر کی آراء

Aagahi Saza Huee

But Gahlib Irfan is not only a poet. He also weaves dreams which cover a vast canvas with assortments of stronge images. He has learnt to live with agony and distress.His faith in the destiny of mankind is the hallmark of his poetry.

And that is the secret of his survival. That as a tormented man and a sensative poet. His undying optimism is fully refleted in this complet.

Main jahan pay doobta raha waheen peey ek prind,
Manzar-e- tuloo -i mahtaab dekhta raha

AKHTAR PAYAMI
Dawn Magzine 28 Th January1999

Aagahi Saza Huee

.... These ordeal in a short span of time are bound to create to illness, frustration , and depression , But it its however, heartening to find that his poems, composed in such unfavaourable circumstances, have little or no trace of bitterness or frustration rather he appears to have proudly wedded his destiny to the sacred soil of this beautiful country...

(AFSAR MAHPURI) *Weekly Mag* 23-29 Sept1999

Gahlib Irfan is a well known poet. His Style is simple and he picks up words from every day language. He has not only followed brilliantly the tradition of Ghazal but has also given a touch of

freshness by using unconventional symbols. The audio visual imagery is yet another prominent quality of his poetry.

SABA EKRAM
Daily *Leader* 20 January1994

Ghalib Irfan has written almost all genres of poetry. But it is my view that his creative activity has been well performed in ghazals: though his poems are also notable, but his ghazals are more artistic and more attractive. He has well maintained the standard of all necessary values of this poetic genre such as tone, style, vocabulary, idioms, mataphors and other elements.

SHAFIQ AHMED SHFIQ
Busness Recorder 11 October 2009

روشنی جلتی ہوئی

...یہ وہ دور ہے جس کے ہر طور میں نور بکھرنے کے بجائے خود روشنی جلتی ہوئی نظر آتی ہے "آگہی سزا ہوئی" اور "م صلی اللہ علیہ وسلم" کے مجموعہ ہائے کلام کے مصنف نے غالباً اسی لیے اپنی نئی شعری کتاب کو بھی "روشنی جلتی ہوئی" کا سرنامہ دیا ہے۔ اس کتاب کے اشعار بجائے خود اپنے سر آغاز کی گواہی بنتے محسوس ہوتے ہیں۔

شعلہ زن تھی آگ پہ چلتی ہوئی،
میں نے دیکھی روشنی جلتی ہوئی

روشنی آگ پر ننگے پاؤں چل رہی ہو تو کوئی پھول نہیں کھل سکتا۔ صبا صرصر بن جاتی ہے اور گھٹاؤں کے آنسو جل تھل ایک کر دیتے ہیں غالب عرفان کا قلم عصرِ رواں کے دکھ بیان کرتے ہوئے انسانیت کا علم بن جاتا ہے۔

پروفیسر محمد فیروز شاہ میانوالی'
ماہنامہ تخلیق لاہور

انہوں نے ذہنی سفر کے ساتھ ذہنی اور ذہنی سفر کے کئی نئے ذائقے چکھے۔ اہم بات یہ ہے کہ زندگی کے یہ سب تجربے ان کی شاعری میں لطافت' گداز' جدت اور تازگی پیدا کرنے کا باعث

بنتے چلے گئے اور اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ غالب عرفان کے تذکرے کے بغیر جدید اردو شاعری کا گراف مرتب نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر انور سدید

نوائے وقت سنڈے میگزین ۲۹ ردسمبر ۲۰۰۲ء

ROSHANI JALTI HUI

Gahlib Irfan`s verse and poems speak of the agony of a wounded soul,besides Ghazals which have their own charm, he has also written poems and experimented with various structural devices. The poet`s grasp of the classical poetry has helped him a great deal in develping his own style.

AKHTAR PAYMI

"Book & Authors" *Dawn* March16, 2003

غالب عرفان نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کا جرأت مندانہ اظہار کیا ہے مگر کہیں بھی جمالیاتی اقدار کو ٹھیس نہیں پہنچائی اس کی غزل خاصی خوبصورت غزل ہے جو پڑھنے والے کو اس عہد کا بصیرت افروز شعور دینے کے علاوہ اس کے اندر وہ نشاطیہ کیفیت بھی پیدا کرتی ہے جو ایک زندہ ادب کا رول ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔

میرزا ادیب ۴ رمارچ ۱۹۹۲ء

پیش لفظ

(روشنی اور پرچھائیاں)

غالب عرفان

غالب عرفان کی شاعری کا بنیادی پہلو شعور حیات ہے۔ ہمارے زمانے کے کم شاعروں نے شعر اور خاص کر غزل کے تقاضوں کی تکمیل کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے جدید زندگی کے مسائل کو اپنے کلام میں منعکس کیا ہے۔ غالب عرفان کا شمار انھیں چند گنتی کے شاعروں میں ہوگا جو شعور حیات کو شعر میں منقلب کر دیتے ہیں۔ نظم میں ان کا لہجہ ذرا براہ راست تخاطب کی طرف مائل ہے لیکن غزل میں وہ خود کلامی کے انداز میں دنیا پر رائے زنی کرتے ہیں۔ اس رائے زنی میں طنز یا برتری کا شائبہ نہیں بلکہ ایک خفیف سی رنجیدگی ہے' گویا شاعر کو احساس ہے کہ زندگی کے تقاضے پورے کرنا اور دامن کو پاک رکھنا بہت مشکل بلکہ شاید ناممکن کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب عرفان کے یہاں زندگی کے حقائق کی طرف اشارہ تو ہے لیکن کوئی مصلحانہ انداز نہیں۔

فن کی طرف نگاہ ڈالیں تو غالب عرفان کے یہاں سب سے نمایاں شے نئی زمینوں اور نئے الفاظ کا اہتمام ہے۔ لفظے کہ تازہ است بہ مضموں برابر است۔ کا ایک اظہار تو ایسے غزل گویوں کے یہاں ملتا ہے جو ہر قیمت پر نئے الفاظ کو برتنے پر تیار رہتے ہیں۔ اور ایک اظہار غالب عرفان کی غزلوں میں ملتا ہے کہ وہ ایسے الفاظ تو لاتے ہیں جو غزل کے سکہ بند الفاظ نہیں ہیں لیکن وہ انھیں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان کی غزل میں وہ اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔ ممکن ہے یہ ہنر انھوں نے اقبال سے سیکھا ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں ایسے شعرا کم ہیں جو غزل کو نظم سے دور رکھتے ہیں اور غزل کی روایتی لفظیات سے پرہیز کے باوجود غزل ہی کی فضا قائم کرتے ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی

۳ر دسمبر ۲۰۰۸ء

تقریظ

عرفانیت سے بھرپور شاعری

مَیں نے اپنی مسافتوں میں کبھی
کی نہیں راہِ مختصر کی تلاش

یہی وہ خاص بات ہے جس کی وجہ سے غالب عرفان نے عملی زندگی میں بھی بہت کچھ حاصل کیا اور ادبی دُنیا میں اپنی ایک پہچان بنائی ہے جس کا اعتراف کشمیر سے بمبئی تک اور کراچی سے کوئٹہ تک اہلِ علم و دانش نے کیا ہے۔ جنھوں نے ان کے تجربے کی گرمی' احساس کی تازگی' فنی شعور کی پختگی اور لہجے کی بیباکی کی تعریف کی ہے۔ ان کے اشعار میں معنویت' ندرت' زندگی کی اعلیٰ اقدار اور اختصار کی نشاندہی کی ہے۔

یہ چشمِ عرفان کی جستجو ہے جس نے انھیں زندگی کی اعلیٰ اقدار کی تباہی اور بربادی کا سبب بتایا کہ معاشی فکر اور اسلحہ کی فراوانی وہ اہم اور بنیادی عناصر ہیں جن کی وجہ سے ہمارے خطے میں انسانی زندگی سے خلوص ختم ہوتا جا رہا ہے اور نفرتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک تازہ غزل کے دو اشعار میں یوں کیا ہے:

معاشی فکر کی بے حس تگ و دو
خلوصِ زندگی بھی کھو رہی ہے
کسی کے ہاتھ کی بارود کی بُو
کسی کے دل میں نفرت بُو رہی ہے

ان نفرتوں کے نتائج کتنے ہولناک ہوتے ہیں اس کو بھی غالب شریف کی بصارتوں نے دیکھا اور انھیں اس کا عرفان ہوا جس کو انہوں نے برنگِ شاعری میں یوں بیان کیا ہے:

بس ایک منزل کی آس میں کچھ مسافروں نے
کہاں پہ کس کا لہو بہایا یہ میں نے دیکھا

بصیرتیں بھی نہ چشمِ عرفاں کو راس آئیں
کہ گھر جو اُجڑا بسا بسایا یہ میں نے دیکھا

دیکھا تو غالب عرفان نے اور بھی بہت کچھ ہے جس میں نام نہاد جمہوریت اور اقتدار کی بھوکی قیادت بھی ہے' جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا:

جمہور کی مسافت مشکل نہیں ہے پھر بھی
ہر اقتدار بھوکی سرکار سامنے ہے

اور انسانوں کے درمیان پیدا ہونے والی وحشت ونفرت بھی دیکھی' جس کے لیے انہوں نے سوچا کہ روح قائد بیتاب وپریشان ہوگی اور اپنے ہم وطنوں سے سوال کر رہی ہوگی:

اگر یہ سچ ہے
کہ میں نے تم کو شعور بخشا

....

دلوں میں جذبے جگائے رکھے
محبتوں کے سہانے سپنے سجائے رکھے
یگانگی کی مہکتی خوشبو نفس نفس میں
بسائے رکھی
تو پھر یہ نفرت کی ٹعلگی کیوں؟

....

....

(روح قائد کا پیغام)

یہی زندگی کے وہ عکس ہیں جنہیں غالب عرفان نے اپنی غزلوں اور نظموں میں جابجا پیش کیا ہے اور ان کا قاری ان میں اپنی سوچ کے مطابق رنگ بھرتا چلا جاتا ہے اور عرفان کی باتیں اس کے دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ انہوں نے کہا:۔

میں فقط عکس ہی بناتا ہوں
جانے کون آ کے رنگ بھرتا ہے

عمر اور تجربہ بظاہر انسان کی رفتار میں کمی پیدا کرتے ہیں مگر حقیقتاً اب اس کے شعور کی پختگی مقدار کے مقابلے میں معیار کو بڑھاتی ہے اور اس کو بات کرنے کے نئے ڈھب سکھاتی ہے:۔

عرفانِ زندگی کی مسافت میں ایک دن
ہم سے ہمارے تیز قدم دور ہوگئے

یہ تو وہ بات ہے جو بظاہر نظر آتی ہے مگر جیسا کہ اوپر کہا گیا اب غالب عرفان کا قاری اور نقادانِ ادب اس کی گواہی دیں گے کہ مقدر کے ساتھ ہی معیار میں بھی اضافہ ہوا ہے اور غالب عرفان' جو بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں' انھوں نے جدید نظموں میں بھی اپنی بات بخوبی کہی ہے اور وارداتِ قلب ونظر کا بھرپور اظہار کیا ہے:۔

کتابِ دل کے ورق پھر اُلٹے جاتے ہیں
اذیتوں کے بجھی زخم کے پسِ پردہ
یہ کون ہے؟
جو نئی چہرگی کے پرتو میں
سوال بن کے مرے روبرو چلا آیا
جبیں پہ فکر کی شکنیں لیے
یہ لب بستہ
شعورِ وقت کا ملبوس پہنے آیا ہے
یہ کون مجھ سے مسلسل کلام کرتا ہے؟
میں سوچتا ہوں
یہ میں ہوں کہ میری تنہائی؟
بپھر رہی ہے مجھی پر بشکلِ طوفانی
پریشاں فکر کی لہروں سے
میری نس نس میں
گزارتی ہے نئی وارداتِ قلب ونظر

(نئی واردات)

نو سال کے طویل عرصے بعد شائع ہونے والے غالب عرفان کے اس چوتھے مجموعۂ کلام میں سے کچھ تخلیقات میرے سامنے ہیں۔ جس طرح کسی چاول کی دیگ میں سے چند چاول دیکھ کر دیگ کے معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اسی طرح ان کی شاعری کے تازہ نمونوں کا تجزیہ ان کی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ:

ہوئی ہے نم دوبارہ میری مٹی
نئے سانچے میں ڈھلنا چاہتا ہوں

اُن کی مٹی نے دوبارہ نم ہونے کے بعد وہ سوندھی سوندھی خوشبوئیں بکھیری ہیں جن سے ان کا قاری مسحور بھی ہوتا ہے اور نظموں کی صورت میں ان کے اظہار کے نئے سانچوں سے لطف اندوز بھی' جو اُن کی غزلوں کی طرح خوبصورت ہیں۔ امید ہے دیگر غزلیں اور نظمیں صاحبِ ذوق قارئین کے معیار پر پوری اُتریں گی اور ناقدین سے خراجِ تحسین حاصل کریں گی۔ میں اس اختصاریہ کا اختتام اس دُعا پر کروں گا:۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

ڈاکٹر جمال نقوی

(روشنی اور پرچھائیاں)

GHALIB IRFAN`S POETRY

Poet Galib Irfan is an eminent and accomplished exponet of *Gazal* The char:smatic genre of the romantic Urdu verse and the central feature of our cultural heritage. Ghalib Irfan richly deserves Urdu lovers` gratitude for artfully combining respect for classicism with the thrill of hearty innovation. Moreover, when translated into English his couplets stand out l'ke sparkling jewels. one specimen should suffice:-

زمین پر آسماں رکھا ہُوا ہے
اور انساں درمیاں رکھا ہُوا ہے

(Layer of the firmament is placed upon
the floor of Earth and sandwiched in
between happens to be the human being)

Such b'illiant pieces of poetry are certainly bound to earn kudo s both from the East and the West.

TISHNA BRELVI

22 December2011

ڈاکٹر سید قاسم جلال (بہاولپور)

روشنی جلتی ہوئی کے اشعار میں شاعر کے افکار و تخیلات کہساری ایک ایسی خوے خوش خرام کی طرح نظر آتے ہیں جو راہوں کے پیچ و خم کی پروا کیے بغیر رواں دواں رہی ہے۔ تجربات و مشاہدات کی ایسی ماہرانہ ترجمانی بہت کم شعرا کے حصے میں آئی ہے۔

رؤف نیازی

غالب عرفان ایک تاریخ' ایک تہذیب اور ایک روایت کا پاسدار شاعر ہے۔اس کے یہاں انسانی اقدار کی شکست و ریخت اور بدلتے ہوئے سماجی تناظر کا گہرا ادراک ملتا ہے اس کا شعری سفر ذات کے شعوری ادراک سے کائنات کا حتمی اثبات کرتا نظر آتا ہے۔اس کی فنی چابکدستی اس کے مشاہدوں' تجزیوں اور احساسات کو اپنی تخلیقی لمس سے اس طرح اجال دیتی ہے کہ قاری کی نگاہوں میں بھی اپنی خیرگی کو منعکس کرنے لگتی ہے۔

ڈاکٹر رشید نثار (راولپنڈی)

غالب عرفان نے قول اور افکار میں کسی کی تقلید اور ادبی بود و باش میں کسی کی پیروی نہیں کی ہے۔فی الوقت زمانہ اختصار پسندی کی طرف مائل ہے طبیعات نے انسانی خیالوں کو ایک خول میں بند کر کے اسے کیپسول بنا دیا ہے مگر غالب عرفان نے اپنے خیال کو کھلے ورق کی طرح پیش کیا ہے اور توفیق خداوندی کا ایک اور ثبوت دیا ہے کہ وہ یادگار غزلیں طویل بحروں میں کہہ سکتا ہے اور اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے خیال کو (Capsule) بھی بنا سکتا ہے چنانچہ اس کی شعوری نفسیات میں سمندر کا استعارہ تاریخ' آئینہ اور سچائی کے حوالے میں اس کی صدائے احتجاج کو سنا جا سکتا ہے۔اس نے زیادہ موثر صورت میں' بے شمار میلانات کی موجودگی میں' بلکہ غالب صدری کے حصار میں سنجیدگی کے ساتھ اصولوں کی بات کی ہے۔اور ایک امتیاز پیدا کیا ہے جسے حسن' حقیقت اور قدر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

شاعری کی جدید حسیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ شاعری کو عصر جدید کے مطابق برتا جائے اور آپ کی شاعری اس اصول پر پوری اترتی ہے۔(۱۸ر جولائی ۲۰۰۲ء)

حرفے چند

(روشنی اور پرچھائیاں)

ہندو پاک میں میرے نادیدہ احباب کی فہرست بہت طویل ہے لیکن میں انہیں نادیدہ نہیں سمجھتا کیونکہ ان کے شعری اور نثری کارناموں میں، میں اکثر خود کو ان سے محوِ گفتگو پاتا ہوں۔ غالب عرفاں میرے ایسے ہی شناساؤں میں سے ہیں بلکہ "شناساتر" ہیں کیونکہ ان کے نام میں میرے محبوب و مرغوب سخنور غالب کا نام شامل ہے۔ جس پر میں نے چھوٹی بڑی بیس کتابیں تصنیف کی ہیں۔

غالب عرفاں نے سے ان کے کلام کی وجہ سے میں تھوڑا بہت پہلے ہی واقف تھا مگر جب مجھی سید معراج جامی ان کا کچھ غیر مطبوعہ کلام میرے پاس لائے تو گویا شاعر بہ نفسِ نفیس اپنی تمام تر تخلیقی قوتوں کے ساتھ میرے سامنے جلوہ گر ہو گیا۔ غالب کا نام آتے ہی پہلے خیال انہی غزلوں کی طرف گیا جو غالب کی زمینوں میں ہیں۔ غالب کی مشہور غزل ہے ۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ تر یاد آیا

اس زمین میں غالب عرفاں کی دو غزلیں ہیں جن کے کل اشعار چودہ ہیں گویا غالب کی غزل کے اشعار سے چار شعر زیادہ۔ یہاں کلام غالب کا کلام غالب عرفاں سے مقابلہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ رجحانات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

ایک بات ذرا موضوع سے ہٹ کر بھی کہتا چلوں۔ غالب کی اس نسبتاً سادہ غزل میں پورا رنگ غالب موجود ہے یہ غزل چوبیس سال کی عمر یا اس سے کچھ پہلے کہی گئی تھی۔ مطلع میں "دل جگر تشنۂ تر یاد آیا" کے مصرعے نے لگ بھگ پون صدی تک شارحین غالب کو اُلجھائے رکھا اور وہ بھی پہلے دو لفظوں کو "دل و جگر" سمجھا کئے۔ آخر یہ گتھی "بہارِ عجم" نے سلجھائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ "جگر تشنہ" ایک ترکیب ہے جس کے معنی ہیں "تشنہ تا بہ جگر یعنی بہت زیادہ تشنہ (تشنہ بمعنی

خواہشمند) مطلب یہ کہ دل فریاد کرنے کا بہت زیادہ آرزومند ہوا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ اور بہت سی ترکیبوں کی طرح غالب نے یہ ترکیب بھی کلام بیدل ہی سے اخذ کی تھی۔ غالب کی طرح اس غزل میں اور بھی کئی باتیں ہیں جو صرف غالب ہی سے مخصوص کہی جاسکتی ہیں۔ اس کا بیان الگ سے کسی اور مضمون میں شامل کروں گا۔ غالب عرفان کی ان دو غزلوں میں پانچ ہی ایسے قوافی ہیں جواُن کی اور غالب کی غزل میں مشترک ہیں ان کے طریقہ استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر جو اگر جدید نہیں تو قریب بہ جدید ضرور ہے۔ کس طرح سوچتا ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

غالب	غالب عرفان
سادگی ہائے تمنا یعنی	تجھ کو پانے میں جو مجھ پر گزرا
پردہ نیرنگِ نظر یاد آیا	عرصۂ فکر و نظر یاد آیا

☆

زندگی یوں بھی گزر جاتی	تہی دامن جو میں واپس لوٹا
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا	سبق راہ گزر یاد آیا

معنویت اور زبان وبیان سے قطع نظر، فکرونظر، عرصہ فکرونظر، سبق راہ گزر وغیرہ ایسی ترکیبیں ہیں جو غالب کے زمانے میں ناپید تھیں نئے زمانے نے ان سے مفہوم حاصل کیا ہے وہ اس عہد میں ممکن نہ تھا۔

غالب عرفان نے یہ اسلوب بیشتر جگہ روا رکھا ہے اور بعض مقامات پر بڑی چابکدستی سے برتا ہے۔ بعض غزلیں تو پوری کی پوری ایسی ہیں کہ اگر غالب عرفان اپنا سارا کلام اس رنگ میں کہیں تو خاص انہی کا اسلوب تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک غزل کے چند شعر دیکھئے۔

کھول کر اک کتاب دانائی
جھیلتا ہوں عذاب تنہائی

تیرے چہرے کی دھوپ کے آگے
سایہ سایہ ہے میری بینائی
لمس مانوس کی نئی خوشبو
لے کے آئی کہاں سے پُروائی
میں ہوں رفتار وقت کا دریا
تو سمندر مثال گہرائی
دشت میں بھیؔ ہوا کی سرگوشی
تیری آواز بن کے لہرائی

ان اشعار میں ممکن ہے آپ کو بعض باتیں غیر مانوس لگیں مگر حق یہ ہے کہ ان میں معنویت، ندرت اور سب سے بڑھ کر شعریت کی کمی نہیں۔

غالب عرفان نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ میری رائے میں ان کی پابند نظموں سے آزاد نظمیں زیادہ پُر لطف اور پُر تاثیر ہیں۔ غالب عرفاںؔ کے کلام سے لطف اندوز ہو کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ جو ہر شاعری سے مملو، نئی نئی تراکیب تراشنے والے، اختصار پر قدرت رکھنے والے اس شاعر کو پروردگار اونچے مدارج عطا فرمائے۔

کالی داس گپتا رضا-۲/۱ اکتوبر ۱۹۹۹ء - بمبئی

I K Gujral
Former Prime Minister
India

October 20, 2008

My dear Ghalib Irfan Sahib,

Thanks for your letter of 1st October. While I admire your contributions to the Urdu poetry, I am indeed not adequately equipped to comment on its literary value. All the same I am sure your contributions would continue to occupy a commendable position in the Urdu literature.

Warm regards.

Sincerely,

[I.K. GUJRAL]

Mr. Ghalib Irfan
"Saiban"
R-263, Sec. # 8, North Karachi
Karachi-75850
Pakistan

5 Janpath New Delhi-110011
Tel 3021 - 4350, 2379 4433 Fax 2379 4444
E-mail gujarik@sansad nic in

ان کے اکثر اشعار معنی کے لحاظ سے بڑے ہمہ رنگ اور متنوع ہیں اور ایک شعر پوری نظم اپنے اندر سمیٹے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔ جناب غالب عرفان کوزے میں دریا بند کر دینے کے فن سے واقف ہیں ان کا مطالعہ وسیع ہے مگر اسے ایجاز و اختصار میں قید کر دینا جانتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے اکثر حساس مسائل کو شدت سے محسوس کیا ہے اور ان کے نتائج کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور فیصلہ سنایا ہے۔ وہ اخذ مطالب میں بہت ذکی الحس اور دوررس شعراء میں سے ایک ہیں۔ ان کے اشعار کے مطالعے سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے مشاہدے میں دوسروں کے مشاہدے کی رنگ آمیزی سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے خارجی موضوعات ان کی داخلیت میں ڈوب کر شعر کا قالب اختیار کرتے ہیں۔

محسن اعظم محسن ملیح آبادی

روشنی جلتی ہوئی

غالب عرفان

غالب عرفان کے دیدہ ور شاعر ہونے سے انکار ممکن نہیں۔ ان کی شاعرانہ دانش و بینش کسی خشک فیلسوف کا شعور نہیں۔ وہ اپنے تصور اور خیالات کو احسن شعریت میں ڈبو کر پیش کرنے کے ہنر سے آگاہ ہیں۔ میرے ذاتی تاثرات سے بالکل الگ' انتقادی تناظر میں ان کی شاعری کے وافر اشعار آفاقی شاعری کے آئینہ خانے میں ایک شفاف آئینے کی طرح ہیں۔ وہ اپنے اشعار سے اکثریت کو ہم آہنگ کر دینے کی شاعرانہ خوبی سے متصف ہیں۔ وہ شاعری کے صوری و معنوی محاسن و بدائع کے چابک دست اور سلیقہ مند صورت گر ہیں۔ وہ احتسابی شاعری کی اُس بلندی کو چھو رہے ہیں جہاں بہت کم شاعروں کی رسائی ہوتی ہے۔ شاعری تو بہت لوگ کرتے ہیں مگر دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ دل و دماغ سے کتنے قریب ہیں' معاملات زندگی پر ان کی گرفت کتنی ہے۔ اجتماعی وانفرادی سوچوں' مشاہدات واحساسات سریع التاثیری میں کیا مقام رکھتے ہیں۔

محسن اعظم محسن ملیح آبادی

روشنی اور پرچھائیاں

باب ۹

خُودمرکزیت اور رومانوی شاعری

خُودمرکزیت رومانوی شاعری کا ایک بڑا اور خاص وصف تصوّر کی جاتی ہے جو کہ بڑے ادب کی تخلیق میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔دُنیا کے بڑے رومانوی شعراء اور یورپ کے رومانوی مفکرین اور فلسفیوں کی طرح غالب عرفان کے کلام میں آزادی کی تڑپ، عالمی امن کے قیام کی خواہش ،نوعِ انسانی سے ہمدردی،ظلم واستحصال اور جبروتشدد کے خلاف بغاوت اور مزاحمت اور وطن کی محبت کا جذبہ موجزن ہے۔

''فکر کا انداز بدل دو''اور''جنگ جاری ہے''اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

فکر کا انداز بدل دو

مکمل نظمیں صفحہ ۴۴ سے ۴۶ تک''ایک انقلابی ومزاحمتی فکر اور دانشور'' کے تحت موجود ہیں۔

وہ ایک رومانوی تخلیق کی طرح اپنے آئیڈیل سے پیار کرتے ہیں اور اُمید کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔آئیڈیل کے حصول میں ناکامی کے سبب ان کے اندر احساسِ محرومی جنم لیتا ہے۔یہی احساسِ محرومی فن کی تخلیق کا موجب بنتا ہے۔یعنی احساسِ محرومی حیات بخش اسلوب میں ڈھل کر حیاتِ آفرینی میں بدل جاتا ہے۔

دیگر شعراء کی طرح وہ بھی حسن وعشق سے الگ نہیں۔لیکن زندہ انسانوں کی طرح وہ بھی کسی نہ کسی سے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور رہا۔

آیئے دیکھتے ہیں غالب عرفان کیا کہتے ہیں۔

شہکارِ جمال

کچھ اس طرح سے کھٹکتی ہے تری بے مہری
کہ جیسے تیر کوئی دل میں کھب کے رہ جائے
ترا فراق مجھے اس قدر گراں گزرا
کہ روح جسم سے ہردم فرار ساچاہے

☆

کچھ اس طرح سے فروزاں ہے تمہاری یاد ہوئی
کہ جیسے چاند ضیاپاش ہو اندھیروں میں
ترے خیال کے جھونکے کچھ ایسے لہرائے
چلی ہو موجِ صبا جس طرح سویروں میں

☆

وہ صبح قرب کے لمحات کی گواہ رہی
یہ صبح حسرت و بے چارگی کی شام ہے اب
وہ صبح، صبحِ ازل کی طرح مقدس تھی
یہ صبح کیفیتِ حشر کا پیام ہے اب

☆

وہ قرب ایسی حقیقت کہ اب گمان لگے
وہ قرب آج مجھے یاد آرہا ہے کیوں
خیال و خواب تو اسرار کائنات نہیں
مری حیات میں تخلیق پا رہا ہے کیوں؟

☆

وہ تیرے لب ترے عارض کی سرخ سرخ بہار
کہ جیسے جوہرِ یاقوت پھٹ پڑا ہو کہیں

وہ تیری آنکھ کا جادو بھرا لطیف خمار
کہ جس کے نشہ کے آگے شراب کچھ بھی نہیں

☆

تری حسین سی رنگت ترے بدن کا نکھار
کہ جیسے صبح کی دیوی نے لی ہو انگڑائی
تری کھنکتی ہنسی کی وہ نقرئی جھنکار
فضا میں جیسے کہیں بج رہی ہو شہنائی

☆

وہ لٹ وہ بکھری ہوئی زلف کے حریری تار
کہ جس کے سامنے ہوں ہیچ اطلس و کمخواب
وہ بانکپن وہ ادائیں وہ مضطرب خد و خال
کہ بجلیاں سی نکلنے کو جیسے ہوں بے تاب

☆

وہ تری مرمری باہوں کا سحر خیز گداز
کہ جن کو چھوتے ہی جادو بدن میں بھر جائے
وہ تیرے جسم کے ہر زاویے پہ تیرا حجاب
کہ جیسے صبح کا بھولا بھی شام کو گھر جائے

☆

جوان جسم کی گرمی سے وہ فضا میں تپش
کہ جس کا لمس کوئی آگ سی لگا جائے
ادا ادا سے ترشح سے وہ جنس کی مہکار
نفس نفس میں چھپے شوق کو جگا جائے

☆

تمہارا اب بھی مجھے اس قدر خیال ہے کیوں
وہ لمحہ لمحہ مجھے کیوں عزیز ہے اب تک
تمہارے جلووں کی اس ٹھنڈی آگ کا پرتو
مرے حواس پہ چھایا رہے گا یوں کب تک

☆

میں اور کیا کہوں تیرے حسین پیکر کو
تجھے تو یاد ہی ہوگا وہ ایک شعر مرا
"ترے جمال کی تخلیق کرنے والے نے
ترے جمال کے پردے میں خود کو پیش کیا"

شاید شاعر کو شدت سے اس بات کا احساس ہے کہ اس کی تکلیف اور تہی دامنی کا علاج حال کے پاس نہیں ہے بلکہ مستقبل کے پاس ہے یوں حال سے ماضی اور مستقبل زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ وہ حالی و اقبال کی طرح ماضی کے دور کی تیز روشنی کا متلاشی ہے۔

نذرِ اقبال

اقبال تری فکرِ دل آویز پہ رقصاں
احساس کے شعلوں میں نئی آگ رواں ہے
اقبال ترے جذبۂ ملت کا تقاضا
جو کل تھا وہی آج بھی رگ رگ میں جواں ہے
اقبال تری فکر وہ جمشید ہے جس نے
تحریر کی قوت کا نیا جام پلایا
سوئی ہوئی اک قوم کی عظمت کو جگا کر
تاریخ کو آئینہ ایام دکھایا

اے فلسفیِ وحدتِ اسلام کہ تجھ سے
روشن ہے ابھی شہرِ تمنا کی ہر اک راہ
تو نے جو دیا ذہن کو تحریکِ سفر تو
ہم ہوتے رہے سطوتِ ادراک سے آگاہ

تہذیب کا اک سلسلۂ وقت کہ جس میں
اقبالؔ ترا سازِ تکلم ہے کہ ہم ہیں
اک ولولۂ جوشِ جنوں خیز کہ جس میں
گونجا ہوا تقدیسِ ترنم ہے کہ ہم ہیں

تو ایک صدا ، ایک سفر ایک تمنا
ہم راہِ تمنا کے مسافر ہی رہیں گے
تو نعرۂ توثیق ہے عرفانِ خودی کا
ہم تیری ہر آواز پہ لبیک کہیں گے

ملکی اور بین الاقوامی موضوعات کوفن کا محور ومرکز بناتے ہوئے حبّ الوطنی کے جذبات اورانقلابی خیالات کو بڑی خوش اسلوبی سے شاعرانہ اسلوب بخشتے ہیں۔ بہت سے اشعار اور نظموں کی فضا رومانی اداسی سے معمور ہے وقتی مایوسی وناکامی کو غالب عرفاںؔ نے کبھی خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ایسے حوصلہ شکن ماحول میں جب وہ شدید غم میں مبتلا ہوتے ہیں تو وہ رب کائنات کے حضور حاضری کو اپنی جائے پناہ بنا کر اپنے سکون کا اہتمام کرتے ہیں۔

حمد

خیال تیرا ہے خواب رواں بھی تیرا ہے
شعور وفکر کا حاصل جہاں بھی تیرا ہے

جو راس آئے کسی کو بھی خلوص وضو
نماز تیری ہے وقت اذاں بھی تیرا ہے

جو تیرے قرب سے منصور عصر ہو جائے
میں سوچتا ہوں وہی رازداں بھی تیرا ہے

حیات تیری حقیقت ہے موت تیرا ثبوت
ازل ابد ہی نہیں درمیاں بھی تیرا ہے

یہ جسم و جاں کا تسلسل وجود مٹی کا
یہاں بھی تیرا نشاں ہے وہاں بھی تیرا ہے

شریک گردش لیل و نہار ہم ہیں مگر
زمیں بھی تیری زمان و مکان بھی تیرا ہے

مرے خدا ترا عرفان رکھنے والا تک
ہے جسکی چھاؤں میں وہ سائباں بھی تیرا ہے

☆

عشق رسولؐ غالب عرفان کی شاعری کی اساس ہے۔ اُن کی فکر ذات رسالت مآبؐ کے گرد طواف کرتی ہے اور وہیں سے روشنی کشید کرتی ہے۔ یہ نور مصطفوی کا فیضان ہے کہ جو انھیں یاس و نا امیدی اور بے چارگی کے اندھیروں سے باہر نکال لاتا ہے اور وہ ایک نئی امنگ اور توانائی سے دوبارہ اعادۂ عمل ہو جاتے ہیں۔ غالب عرفان جب حضور نبی کریمؐ کے سامنے دل بے تاب لے کر حاضر ہوتے ہیں، تو ان کی بے چینی، محبت اس درجہ پہنچ جاتی ہے کہ ان کی تخلاقی آفاقیت

سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، اس میں روح پرور ابدیت شامل ہو جاتی ہے۔

کہیں مکین کہیں وصف لامکاں کی دلیل
مزاج عظمت آدم کی آخری تشکیل

عروج حکمت انساں کی عاقبت کی سبیل
ازل کا نور ابد کی حدود میں تحلیل!

کہیں پہ حسن تقاضائے بندگی کا وقار
کہیں پہ حکم، کہیں مشورہ، کہیں تعمیل

طویل سلسلہ فکر و آگہی کی رسا
پیمبری کے چراغوں کی ان بجھی قندیل

مفاہمت کے لیے فہم و درک کا عنواں
بصیرتوں کے لیے غور و فکر کی ترسیل

حقوق و فرض کی سرحد پہ حد آفاقی
عمل کا آئینہ کردار کی نئی تفصیل!

گناہ گار نظاروں کو پردہ محسور
اذیتوں کے سمندر میں رحمتوں کی فصیل

قلم کے بس میں کہاں اس کی مدحت عرفاںؔ
بشر سے بڑھ کے جو خیر البشرؐ کی ہے تکمیل

وہ مسلمانوں کی زبوں حالی اور بے چارگی پر کس قدر مغموم ہیں۔

چاہتی ہے وہ زمانہ وہی رحمت تیری
آج تاریخ کے دوراہے پہ ہے امت تیری

اچھے رومانی شعراء کی طرح غالب عرفان کے مقاصد اور اہداف واضح ہیں۔وہ اقبال کی روایت کو اپناتے ہوئے اسلام کے احیاء کی دعوت دیتے ہیں۔وہ بھارت اور کشمیر میں قیام پذیر مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی پر تڑپ رکھتے ہیں۔

وقت منتظر ہے پھر!

لمحہ لمحہ صدیوں کا روپ لے کے ٹھہرا ہے
گرد اُڑ رہی ہے اور گردشوں کا پھیرا ہے
آتشیں بگولوں کا رقص ہو رہا ہے۔یا
آدمی میں پوشیدہ، وحشیانہ پن پھر سے
شعلۂ جبلت کی شکل میں اُبھرتا ہے
زندگی جہنم کی شعلگی میں جلتی ہے
ہر طرف دھواں صورت
دھند کی کثافت میں
دہشتوں کے منظر ہیں
فردِ پیار کا پیاسا، گولیاں نگلتا ہے
اور لہو اگلتا ہے
خون بہتا رہتا ہے
خون انتقالی بھی! خون جلالی بھی!!
خون انضمامی بھی!! خون انتقامی بھی!!!
خون جسم میں اترے
تو حیات کی صورت، ہر نفس ابھرتا ہے
خون آنکھ میں اترے

تو ستم کی بنیادیں بے ثبات کرتا ہے

وقت راہ تکتا ہے

وقت منتظر ہے پھر

شاعر ہمیں آئینہ دکھاتا ہے جس میں اپنے اور غیروں کے چہرے صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ کس طرح ہمارے اپنے غیروں کے آلۂ کار بن کہ ہماری ہی بربادی کا سامان کر رہے ہیں مگر افسوس ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو شیرِ میسور سلطان ٹیپو کے قول" گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔" کو حرزِ جاں بنا کر بے خوف و خطر موت سے آنکھیں دوچار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ یہ ہمارے اپنے ہی ہیں جنہوں نے شر کی عالمی قوتوں کے سامنے اپنا سرِ نیاز خم جھکا دیا اور اپنے ہی مسلمان بہن بھائیوں پر آتش و آہن کی بارش کردی۔ ایسے لوگوں کا کوئی وطن کوئی دین و مذہب نہیں ہوتا وہ ننگ دین اور ننگ ملت ہیں جو ہمیں مسلسل ذلت و پستی کے عمیق غار میں دھکیل رہے ہیں ان کے چہروں سے نقاب الٹ دو۔ بعض مقامات پر تو شاعر کا لہجہ ذرا تلخ ہو جاتا ہے جب وہ ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو ملک و ملت کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں وہ انھیں میر جعفر و میر صادق کہہ کر پکارتا ہے۔

نذرِ ٹیپو سلطانؒ

خاکِ میسور کا خوددار وہ ٹیپو سلطانؒ
جنگِ آزادی کی تلوار وہ ٹیپو سلطانؒ
حریت کا سپہ سالار وہ ٹیپو سلطانؒ
سر بکف حق کا طلبگار وہ ٹیپو سلطانؒ

اپنے بچپن سے دلیری کا سبق پڑھتے ہوئے
تیغ بردار سدا مثلِ ہوا بڑھتے ہوئے
عزمِ پائندہ لئے کوہِ گراں چڑھتے ہوئے
جذبۂ عشق سے سرشار وہ ٹیپو سلطانؒ

عمر گرچہ تھی ابھی اُس کی فقط پندرہ سال
ساتھ والد کے دکھائی دیا وہ بن کر ڈھال
جنگ پھر جنگ ہے اس کا کوئی لکھے کیا حال
جسم و جاں لے کے تھا تیار وہ ٹیپو سلطانؒ

میر صادق کی وہ غداری وہ میسور کا غم
اور پھر خونِ شہیداں سے رنگا حرف رقم
حق کی للکار کی تاریخ سر نگا پٹنم
سرتا پا برسرِ پیکار وہ ٹیپو سلطانؒ

گھن گرج شیر کی کانوں میں سنایا وہ شخص
اک سبق بن کے ہمیں یاد پھر آیا وہ شخص
آج کے حال پہ ہم سب کو رُلایا وہ شخص
سر بکف حق کا طلب گار وہ ٹیپو سلطانؒ

اُسے معلوم ہے کہ وہ جس منزلِ جنوں کا مسافر ہے کوئی بھی اس کا ہم سفر نہیں ہے۔ رنج والم سائے کی طرح اس کے ساتھ ہیں لیکن وہ انہیں اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ مسلسل صدموں کے باوجود اس کے حوصلے شل نہیں ہوئے۔ جوش، تڑپ، ولولہ، امید و یقین، عزم و استقلال ایسی خوبیاں ہیں جو غالب عرفان کے خلق زندگی کی عکاسی کرتے ہیں جوش اور سادگی میں ایسی کشش ہے جو ہر دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کلام میں بلا تفریق رنگ و نسل اور مذہب و ملت تمام بنی نوع انسان سے ہمدردی اور الفت و محبت کا پیغام ملتا ہے۔ شاعر ایک گلوبل ولیج کا خواب دیکھتا ہے جہاں امن و آشتی ہو۔ کوئی کسی کا حق غصب نہ کرے۔ کوئی کسی کی دل آزاری نہ کرے۔ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا متمنی ہے تمام انسانیت کو محبت و گل کا محبت آمیز پیغام دیتا ہے۔ پاکستان کو اسلام کے قلعہ کی صورت میں مضبوط اور عظیم تر دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام اور پاکستان کی بقا، برتری اور تمام عالمِ اسلامی کے فکری و عملی سلفی ان کا مشن ہے۔

وہ ایک اہلِ زبان ہے۔اس کے سبب زبان کا لطف اظہار کو دوبالا کر دیتا ہے۔اظہار میں موسیقیت ابلاغ ،بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔غالب عرفاں کے کلام میں بے پناہ روانی اور موسیقیت ہے جو اس کی شاعری کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

☆......☆

باب ۱۰

غالبؔ واقبالؔ اور غالب عرفانؔ

غالب عرفانؔ شاعری میں غالبؔ اور اقبالؔ سے شدید متاثر ہوئے بلکہ آگے چل کر وہ اقبال ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوئے۔ اقبال کی فلسفیانہ اور مفکرانہ تخلیقی ظرف نگاہی، موشگافیاں اور آن بان تو نہیں ہلکا سا لیکن انتہائی دلکش اور متاثر کن اسلوب اور انداز ملتا ہے۔ اس لیے کہ اقبال کی فکری وسعت اور پھیلاؤ عالمی ادبیات میں کسی اور کو نصیب ہی نہیں ہو سکتا اور اس کے امکانات بھی کم ہیں۔ نہ تو اس طرح کا عالمی تناظر اور نہ اس قدر کشادہ ظرفی کسی اور کے یہاں ملتی ہے۔ اس قدر ہمہ گیری وژن اور صلاحیت کار کا حامل فنکار شاید ہی کسی اور زبان و ادب کو مل سکے۔ تقریباً اسی وژن کے اندر ہی اندر کوئی اگر اظہاریت سے ہمکنار ہو جائے تو یہ اس کی کامرانی اور خوش بختی ہے۔ اس طرح وہ اپنی تخلیقی انفرادیت کا اہتمام کر سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ غالب عرفانؔ جیسا اظہار اور تخلیقی تشخص بھی اس دور میں محالات سے ہے اور کم یاب ہے۔ یہی وہ صورت اور مقام ہے جہاں غالب عرفانؔ اپنی قلمرو قائم کر سکتے ہیں اس عہد میں یہی ایک بڑی بات ہوگی۔ دراصل قدرت کاملہ کو شاید عالمی اور آفاقی ادبیات میں اقبال کی بصیرت افروزی مطلوب ہی نہیں ہے۔ بس اسی سے مُستفید ہو کر ملتِ اسلامیہ کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے تو کی جا سکتی ہے۔

ان کے ہاں غم نوحہ گری نہیں بلکہ کرب دھیمی آنچ کے ساتھ سلگتا رہتا ہے اور ایک لطیف احساس کے ساتھ تخلیق یافتہ میں بدل جاتا ہے۔ غم کی ہلکی آنچ اور دھیمے سُروں میں ایک فنکار کا تخلیقی اظہار بے پناہ تاثیر کا حامل بن جاتا ہے۔ ان کے تخلیقی اظہار میں تازگی، روانی، تخلیقی ہما ہمی اور خاص دروبست ملتا ہے۔ وہیں خاص لوچ اور تاثیر کا بھی پتہ چلتا ہے۔

فقیر گہرے غور وفکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے کسی ادیب اور دانشور کے حقیقی خدوخال دست بردِ زمانہ سے بچ کر سامنے آتے ہیں تو اس شخصیت کی تخلیقی

اور دانشورانہ حیثیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

غالب عرفانؔ کے بارے میں بڑی آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک عظیم فنکار ہے۔ غالب عرفانؔ کا اسلوب اور انداز سب سے جُدا اور مختلف ہے۔ یہ مصرع غالب عرفانؔ کی ہمہ گیر انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہے:

برنگِ کعبہ ہر ایک سلسلہ طواف میں ہے

مطالعاتی و مشاہداتی وژن اور تہذیبی و ثقافتی تناظر مختلف ہونے کے سبب دوسروں سے قدرے الگ اور ہی شخصیت دنیائے ادب میں نمودار ہوتی ہے اسی کو تخلیقی انفرادیت اور اسی بناء پر ایک الگ فکری وفنی تشخص وقوع پذیر ہوتا ہے۔ وسائل تخلیقیہ کا بڑی خوبصورتی اور چابکدستی ومہارت سے مظاہرہ کیا ہے۔ جسے ہم بخوبی غالب عرفانی اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ وہ اس عہد کی غزل کے نئے کارساز شاعر اور مجتہد ٹھہرتے ہیں۔

☆☆☆

باب ۱۱

اُردو شاعری میں

غالب عرفان کا کردار اور مقام و مرتبہ

شاعری عطیۂ خداوندی ہے جسے یہ صلاحیت ودیعت ہوگئی گویا اسے قوتِ گویائی نصیب ہوگئی۔اس عطائے الٰہیہ کو بروئے کار لانے کے لیے خاصی محنت وکاوش درکار ہے۔کڑی آزمائش سے گزر کر ہی کوئی شخص لفظ کا عرفان پا کر محسوسات وتجربات اور مشاہدات وافکار کی وجدانی تجسیم کے ذریعے نئے حقائق اور امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔اس طرح وہ عوام سے بلند ہو کر خواص میں جگہ پا کر رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھاتا ہے اوران کی حفاظت کا سامان بھی کرتا ہے۔وہ معلوم اور غیر معلوم حقائق کو اپنے پورے تخلیقی وژن کے ساتھ منظرِ عام پر لاتے ہوئے نئی اور غیر موجود حقیقتوں کی تجسیم کرتا ہے۔اس طرح گویا وہ خالقِ کائنات کے حقیقی مدعا یعنی نیابت الٰہیہ کا فریضہ انجام دیتا ہے اور رازہائے حیات وکائنات کے ناگزیر لوازمات کی پورے سیاق وسباق کے ساتھ نقاب کشائی اور تفہیم وتفسیر سے ہمکنار ہوتا ہے۔

کسی بھی شعبہ حیات میں قدم رکھنے کے لیے صلاحیت واہلیت اور دانش وبنیش اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔دیگر شعبہ ہائے علوم وفنون کی بہ نسبت فنونِ لطیفہ کچھ زیادہ ہی تخلیقی وتنقیدی صلاحیتوں کا تقاضا کرتے ہیں۔خصوصاً شاعری تو ہرگز وقت گزاری اور محض شہرت کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک بے حد سنجیدہ اور بامعنی عمل ہے۔اسے بروئے کار لانے کے لیے کس قدر محنت وریاضت اور تفکر کی ضرورت ہے۔اس کا اندازہ تخلیقی آزمائشوں میں پڑے بغیر ہرگز نہیں لگایا جاسکتا۔افسوس اور حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ آج کل ہر کوئی تخلیقی آزمائش اور ترجیحات اور مضمراتی شعریہ سے آشنا ہوئے بغیر ہی کارزارِ شعروادب میں کود پڑنے کو فرضِ اولین جان بیٹھتا ہے اور یوں بیجا شہرت کی خواہش اسے منصبِ تخلیق سے گرا کر عدمِ آدمیت اور عدمِ تہذیب سے ہمکنار کردیتی ہے۔

غالب عرفان اُردو زبان کے ان خوش نصیب تخلیق کاروں میں سے ہیں جنھیں شاعرانہ مزاج اور تخلیقی پس منظر ورثہ میں ملا ہے۔ زبان پر گہری گرفت کے سبب وہ لفظ کو فکری اور لسانی ہر دو اعتبار سے اس کے پورے سیاق وسباق کے ساتھ استعارات کو بروئے کار لاتے ہوئے نئی مگر ہمہ گیر معنویت کی جانب قدم بڑھاتے ہیں گویا وہ خیال کی تجسیم کے ساتھ ساتھ اس کی معنوی توسیع کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔

وہ روایت شکن ہیں نہ روایت پرست۔ وہ روایت کے صالح اور صحت مند عناصر کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور جدید از جدید تر رویوں سے بھی استفادہ کرنے سے گریزاں نہیں ہیں۔ جہاں ان کی شاعری میں غم ذاتی کی کارفرمائی ہے وہیں ان کی شاعرانہ قلمرو میں زمانے بھر کے درد وغم انسان دوستی، انسانیت نوازی، حب الوطنی، انسان شناسی اور ملت نوازی کی کامیاب کارفرمائی بھی ہے۔

حقیقی شعراء اور سچے تخلیق کاروں کی طرح ان کا بھی یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے درد وغم اور حالات وواقعات کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ گویا وہ ان کے ذاتی غم اور مصائب نہ ہوں بلکہ جہان بھر کے دُکھ اور مسائل ہوں۔ دراصل ان کے ہاں غمِ ذات کا غم جہاں اور غمِ انسانیت اور غمِ ملت کی صورت میں منتقل ہوتا ہے اور اجتماعی غم ومصائب ذاتی المیے کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

خود آج میرے مقابل ہیں میرے احساسات
اک ایک پل نئے قاتل کا سامنا ہے یہاں
لمحہ موجود سے معدوم تک
بٹ گیا ہوں وقت کے عرفان میں

وہ کس قدر دُکھ سے کہتے ہیں۔

طلب رسد کے معاشرے میں یہی ہے آئین کارفرما
تباہیوں کے معاوضے پر شعور کو یرغمال رکھنا
ایک بارش کی دعا کا جرم تھا
فصل ساری بہہ گئی تاوان میں

انسانی تہذیب وتاریخ اور وجدان کے تصادم اور معروضی اظہاریت میں کس قدر ہمہ گیریت اور بلاغت ہے۔اس سے تو ایک نئی دنیا اور حیران کن مابعد الطبیعاتی فضا جنم لیتی ہے۔

زندگی تہذیب کی توثیق میں
آدمی تاریخ کی میزان میں
خامشی میں ایک لمحے کا سفر
ایک صدی کا فرق تھا وجدان میں
تاریخ کے دوراہے پہ تہذیب کے ہاتھوں
انسان کو اتنا کبھی ششدر نہیں دیکھا
صدیوں کا اکتساب لئے اپنے عہد میں
میرا وجود میرا زمانہ سفر میں ہے
تاریخ کو جو شہر بسا کر دیے گئے
تہذیب کی صفات مٹا کر دیے گئے

وہ روایت کی اندھی تقلید کے شدید مخالف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ روایت کے غیر صالح اور غیر صحت مندانہ عمل سے انحراف کو ارتقاء کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔

اسی اصول پہ جاری ہے ارتقاء کا سفر
جدید ذہن روایت سے انحراف کرے

ایک مقام پر ان کی قوت برداشت تک جواب دے جاتی ہے اور وہ پکار اُٹھتے ہیں۔

اٹھو اب اہلِ جلوہ گاہ عرفاں
کہ اونچا ہوگیا پانی بھی سر سے

انھیں کس قدر اس خوفناک اور کرب ناک حقیقت کا ادراک ہے کہ۔

صلیب و دار بھی مصلوب ہو کے رہ جائیں
سکوتِ وقت اگر سچ کا انکشاف کرے

وہ ہر طرح کے جبر اور استحصال سے شدید نفرت کرتے ہیں۔وہ عوام کی امنگوں اور انسانی ترجیحات سے کماحقہٗ آگاہ اور موجودہ نظام کی مکروہات اور زہرناکیوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔اس پر وہ

بے حد رنجیدہ ہیں۔

سمجھ سکیں تو سُنیں خامشی کی آوازیں
زبانِ خلق پہ پہرہ لگا ہوا ہے یہاں
مطلوب ہوگیا جو کبھی حق خوں بہا
ہم ہی بطور قرض ادا کردیے گئے

ہمارے رہنما تہی فکر، بے عمل اور رہنمایانہ شعور وصفات سے یکسر عاری ہیں مگر کس قدر دکھ کی بات ہے۔

ہے آشنائی کسی موج سے نہ ساحل سے
مگر سفینے کا ہر فرد ناخدا ہے یہاں
جن پتھروں کو ہم نے ہٹایا تھا راہ سے
ہر میل پہ وہ راہنما کر دیے گئے
طاقت جنہیں ملی وہ تدبر نہ پاسکے
بے دست و پا کو ذہن عطا کردیے گئے

غالب عرفان اپنی بصیرت سے خیر وفلاح اور فوز وکامرانی کا فیصلہ بڑے عزم وحوصلے اور تخلیقی عصری شعور سے انجام دے رہے ہیں۔

وہ میرا عزم ہے کہ حوصلہ جو
صلیب و دار سے پرکھا گیا
بے بصیرت نہ کہے کل کہیں تاریخ ہمیں
وقت کے سینے میں بینائی کا غم رکھنا ہے

ان کے فکروفن میں پُورا عہد جلوہ گر ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ایک نئے عہد کی بازیافت اور صحیح انسانیت کے لیے بے حد مضطرب اور بے چین تو ہیں مگر ناامید نہیں ہیں۔

یہ زندگی ہے یہاں یقیں کے سفر میں دل کا گمان بھی ہے
شعور و فکر و نظر سے پہلے دلوں کا کچھ امتحان بھی ہے

سکوتِ شب کی سیاہ لہروں میں ایک وحشت چھپی ہے لیکن
ہوا کی سرگوشیوں میں پنہاں نئی سحر کی آذان بھی ہے

انھیں اس بات کا کامل ادراک ہے کہ۔

ہر ایک رُخ کی مسافتوں میں ہے جلوہ عرفان و آگہی کا
شعورِ انسان کی دسترس میں زمیں ہی کیا آسمان بھی ہے

غالب عرفان انسان کے مقام و مرتبے سے کس قدر باخبر اور آگاہ ہیں دیکھئے۔

میں بھی اپنی ذات میں ہوں تہہ بہ تہہ اک کائنات
وہ خلاؤں میں اگر ہے دائرہ در دائرہ

وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ۔

فاصلہ سمٹا تو قُربت عیاں جو کچھ ہوا
وہ مری فکر و نظر کا زاویہ بنتا گیا

ان کے غم میں سمندر کی بیکرانی اور صحرائی پھیلاؤ ہے مگر ان کی شاعری یاس و ناامیدی اور قنوطیت کی غماز نہیں بلکہ عزم و حوصلے، فکر و نظر، مستقبل بینی، خیر و فلاح اور عظمتِ انسانی کا سامان کرتی ہے۔ اس ازلی حقیقت کو غالب عرفان نے اپنی تخلیقی بصیرت سے دینِ فطرت سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

کوئی حقیر سا ذرہ ہو یا کوئی سورج
برنگِ کعبہ ہر اک سلسلہ طواف میں ہے

شدتِ غم اور گہری حساسیت نے تاثیر، مشاہدات و تجربات نے گہرائی و گیرائی، تخلیقی وفور اور ہمہ ہمی، مطالعہ اور غور و فکر نے انھیں دور تک دیکھنے کی صلاحیت اور تخلیقی اعتماد بخشا ہے۔ اسی کا نام آگہی اور خود شعوریت ہے۔ آگہی اور خود شعوریت میں کس قدر اذیت ناکی اور اضطراب ہے کوئی نہیں جانتا۔

تھکن سے چُور سفر کا وہ خواب کیسے لکھوں
گزر رہا ہے جو مجھ پر عذاب کیسے لکھوں
یہ لمحہ لمحہ سمٹ کر بکھرتا میرا وجود
یہ اپنا سلسلۂ انقلاب کیسے لکھوں

زندگی کی رونقیں جہل نے سمیٹ لیں
آگہی سزا ہوئی ہر ذہین کے لیے
کتبے مشاہدات کے نسلوں میں چھوڑ کر
انسان تجربات میں مدفون ہوگیا

فن کار اور دانشور، خود آگہی اور شعوریت کی اذیت ناکیوں کے باوجود شعور ہی کو انسانیت اور اس کی بقا و سربلندی کے لیے ناگزیر خیال کرتے ہیں۔

میں نئی تاریخ پر اک عکس ہوں
گم شدہ تہذیب کے آثار کا
دیکھنا ہے اس حصار ذات سے
سارا منظر ذات کے اس پار کا
چشمِ عرفاں سے الجھ کے رہ گیا
مسئلہ تہذیب کی اقدار کا
یہ کیسے لوگ ہیں جو آگہی سے ڈرتے ہیں
مشاہدے سے نئی روشنی سے ڈرتے ہیں
میں سرخمیدہ ملوں تو وہ مصلحت جانیں
مرے بزرگ مری سرکشی سے ڈرتے ہیں

جہاں ان کے کلام میں فکر وفن کے دیگر پہلو ہیں۔ وہیں ان کی تخلیقی وژن میں محبت اور جمالیات کی کارفرمائی بھی فطری اور حیران کن ہے۔

محبت لفظ کی محتاج کب سے
نظر کا ربط ہوتا ہے نظر سے
تمہارے حسن کا معیار اکثر
مری گفتار سے پرکھا گیا

محبت کے باب میں انھیں اس بات کا شدید اندیشہ ہے۔

ترکِ تعلقات کی صورت میں ڈھل نہ جائے
یہ اجتناب یونہی اگر پھیلتا رہا

غالب عرفان کے یہاں انفرادیت اجتماعیت میں اور اجتماعیت انفرادیت میں ڈھل کر خوشصورت ہو جاتی ہے۔

بکھر گیا ہوں میں ساحل پہ ریت کی صورت
مشاہدے کا سمندر مری تلاش میں ہے
میں جب سے شہرِ تضادات کے سفر میں ہوں
مرے اصول کا جوہر مری تلاش میں ہے
بچھڑ گیا تھا جو مجھ سے انا کی راہوں میں
وہی سفر مرے اندر مری تلاش میں ہے

ان کے کلام میں ہمیں ایک نئے عہد اور فکری انقلاب کی گونج واضح طور پہ سنائی دے رہی ہے۔

پیامِ نو جو زمانے کو دے سکے عرفاںؔ
اس انقلاب کا محور مری تلاش میں ہے

غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد اُردو غزل معنوی یکسانیت کا شکار نظر آتی ہے۔ شعراء پامال اور سطحی موضوعات کو ہی شاعرانہ مزاج سمجھتے رہے ہیں مگر غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد اس قدر فکر انگیزیت، فنی رچاؤ، تخلیقی وفور اور تنوع غالب عرفاںؔ کے علاوہ شاید ہی کسی اور میں مل سکے۔ اس قدر خوبصورت، طاقتور اور توانا اظہار غالب عرفاںؔ کے علاوہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔

موجودہ اُردو غزل میں ذات کے سوا قومی و ملّی اور بین الاقوامی تناظر کو کم ہی جگہ دی گئی ہے مگر غالب عرفاںؔ کے یہاں ہمیں بیک وقت قومی و ملّی، بین الاقوامی اور ذاتی و انفرادی تناظر ملے گا۔ ان کی غزل زبان و بیان یا خیال و فکر ہر اعتبار سے گراں قدر اور انتہائی قابلِ توجہ ہے۔ وہ منفرد اور حیران کن تخلیقی وژن کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں بے پناہ مشاہداتی اور تجرباتی وژن کے پس منظر میں، اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان تک پہنچنے میں بار بار کی مہاجرت، اپنوں کی قربانیوں اور بے پناہ مصائب و آلام پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہیں۔

وہ جس کو لکھ نہ سکا بندشوں میں قید قلم
ہم اپنے خون سے وہ انقلاب لکھتے رہے

جب شعور سراپا عشق ووارفتگی کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو اس کے شعور کی بلندی حیران کن انفرادیت یا غیر معمولی تخلیقی بہائی، بصیرت اور خلاقیت میں ڈھل جاتی ہے۔نعتیہ اشعار میں جذب وسرور کی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔

عروج حکمت انساں کی عاقبت کی سبیل
ازل کا نور ابد کی حدود میں تحلیل
مفاہمت کے لیے فہم و درک کا عنوان
بصیرتوں کے لیے غور و فکر کی ترسیل
کہیں تو حسن تقاضائے بندگی کا وقار
کہیں پہ حکم ، کہیں مشورہ کہیں تعمیل

غالب عرفان جب شعور وارتقاء کی منزلیں طے کرتے کرتے خالقِ ارض وسما کے حضور پہنچتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں۔

ذرّے ذرّے میں فروزاں زندگی
تیری عظمت کا نشاں ربِّ جلیل
یہ نظامِ ارتقاء کی رونقیں
تیری بزم آرائیاں ربِّ جلیل
جگمگا جائے شبِ عرفاں میں بھی
زندگی کی کہکشاں، ربِّ جلیل

دراصل غالب عرفان ان شعراء میں سے ہیں جن کی شاعرانہ خلاقیت میں محض متخیلہ کی ہی کارفرمائی نہیں ہوتی بلکہ ان کی شاعری واضح فکری منہاج کی حامل بھی ہوتی ہے۔ان کے ہاں فکر نے خونِ جگر میں نمو پاکر شاعرانہ اظہار کی صورت اختیار کرلی ہے۔جو افکار خونِ جگر سے نمو پاتے ہیں وہ امر ہو جاتے ہیں۔

حضرت غالبؔ کی شاعری انسانی جذبات و احساسات کا ایک محشرستان ہے گویا وہ ایک آئینہ خانہ ہے جہاں ہر سو غالب ہی غالب نظر میں ہے۔

ایک طرف اقبال ہیں جن کی صحیح عظمت اور وسعتِ فکروفن کا اندازہ شاید آنے والے زمانوں میں بھی ممکن نہیں ہوگا۔

اور ایک طرف آپ ہیں کہ آپ کے ہاں انسانی شکست وریخت اور انسان دوستی سے اُبھرنے والا رفیع الشان منظرنامہ اپنی پوری تابنا کی کے ساتھ نئی تہذیبی فلاسفی کا غماز بن جاتا ہے۔ فقیر کے نزدیک آپ کا اختصاص نئی شعری، تہذیبی اور صوفیانہ فلاسفی کی وقوع پذیری میں مُضمر ہے۔ فقیر کے نزدیک یہ اُردو زبان و ادب کی تیسری بڑی کامیابی اور خوش بختی ہے۔ یہ تثلیث عالمی ادب میں واحد کامران انسانی و تخلیقی عمل ہوگا۔

☆☆☆

مصنف کا مختصر تعارف

نام: سید مسعود اعجاز بخاری

مطبوعات

1۔ یونا خان راجس۔ شخصیت اور فکروفن (تحقیق و تجزیاتی مطالعہ) جولائی 1983ء

2۔ اس عہد کے ابرہہ کے لشکری (مجموعہ آزاد نظم جدید) مارچ 2003ء

3۔ عظیم تر پاکستان، عالمی اخلاقی نظام اور امنِ عالم (قومی و ملی اور علمی و ادبی تحریروں کا مجموعہ)

4۔ ڈاکٹر محمد سلیمان۔ شخصیت اور فکروفن 23 مارچ 2012ء

5۔ غالب عرفان اور تخلیقی وجدان (اردو شاعری میں غالب عرفان کا کردار اور مقام و مرتبہ)

زیرِ طبع تصانیف:

1۔ فلسفہ تخلیقِ پاکستان 2۔ اقبال کا آفاقی اور کائناتی حکیمانہ انقلابی تشخص 3۔ تنقیداتِ بخاری

2۔ جموں و کشمیر میں اردو ادبیات کا ارتقاء 5۔ مقدماتِ بخاری 6۔ اوراقِ فلسفہ

غیر مطبوعہ شعری کتب

1۔ صبحِ اعجاز ۔نغمۂ اعجاز 3۔ نطقِ اعجاز 4۔ رختِ اعجاز 5۔ نقشِ اعجاز۔

غیر مطبوعہ نثری کتب

1۔ نقدِ اعجاز 2۔ پرکھ و پہچان 3۔ نقد و نظر اور نقاد 4۔ تاریخ تنقید ادبیاتِ اردو (عالمی تناظر میں) 5۔ تاریخ فلسفہ جدید تعلیم (بشمول پاکستان اور اسلامی دنیا) 6۔ تشکیلاتِ بخاری 7۔ جموں و کشمیر کے چند اہلِ قلم 8۔ جہانِ اعجاز 9۔ نقوشِ اعجاز 10۔ ترجیحاتِ بخاری 11۔ اوراقِ تنقید 12

۔تنقید کے وظائف 13۔نقد ونظر کے آفاق 14۔آفاقِ دانش 15۔موضوعاتِ فلسفہ 16۔کل پاکستان بزم فکر ونظر ایک جائزہ 17۔منیر احمد یزدانی ادبی خدمات

اعزازات

1۔انجمن ترقی اردو لاہور نے 28 مارچ 1983ء میں سند اعتراف سے نوازا اور انجمن کا مستقل معاون بھی قرار دیا۔یاد رہے کہ اس وقت انجمن ترقی اردو لاہور کے ناظم اور روح رواں بابائے اردو ثانی ڈاکٹر سید عبداللہ تھے۔

2۔پاک کشمیر لائبریری اسلام گڑھ' گجرات کی جانب سے علمی وادبی اور تحقیقی خدمات کے اعتراف میں غلام حسین ادبی ایوارڈ 2009ء سے نوازا

3۔ماہنامہ ''ارتعاش'' میر پور آزاد جموں وکشمیر کا 1980ء تا 1984ء نگران اعلیٰ رہا۔

4۔انگریزی ماہنامہ ''دی فیض'' کا لٹریری مدیر رہا۔

5۔ایک دفعہ پاک بھارت کے مشہور شاعر حکیم سید افتخار فخر جو کہ اہل زبان تھے اور لکھنوی دبستان سے ان کا تعلق تھا فقیر کے لیے یہ شعر کہا:

اسی نظر اسی آواز کو ترستے ہیں
چلو بھی چل کے بخاری کو ڈھونڈ کر لائیں

(3 جنوری 1992ء)

علمی وادبی تنظیموں کے قیام میں کردار

1۔بزم فلاح ادب میر پور آزاد جموں وکشمیر 1974ء (بانی)
2۔بزم گلستانِ ادب میر پور آزاد جموں وکشمیر 1975ء (بانی)
3۔بزم فلاح ادب میر پور آزاد جموں وکشمیر 1974ء (بانی)
4۔بزم فلاح ادب میر پور آزاد جموں وکشمیر 1974ء (بانی)
5۔بزم فلاح ادب میر پور آزاد جموں وکشمیر 1974ء (بانی)

موجودہ مستقل پتہ:

مکان نمبر 32اے سیکٹر بی تھری پارٹ سیکنڈ

میر پور آزاد جموں وکشمیر پاکستان موبائل:0312-5506180



سید مسعود اعجاز بخاری

تنقید کے میدان کے بے مثل مصنف
کشمیری سہی، پاک وطن کے ہیں لکھاری
انساں کو پرکھتے ہیں جو قرطاس و قلم سے
سادات کے مسعود ہیں اعجاز بخاری

نہ جانے یہ کس مفکر کا قول ہے کہ یہ دنیا محض اتفاقات سے وجود میں آئی اور اس کے اختتام تک محض اتفاقات پر ہی اس کا سفر جاری رہے گا' کوئی اتفاق اگر حسنِ اتفاق میں بدل جائے تو آدمی ذرّے سے آفتاب بھی بن جاتا ہے۔ بطورِ مسلمان اگرچہ میں اس دلیل کو نہیں مانتا لیکن اس حسنِ اتفاق کو کیا نام دوں جب مجھ سے محبت کرنے والے میرے نادیدہ ہمدم و دمساز محترم سید مسعود اعجاز بخاری سے شناسائی میرے ایک اور نادیدہ دوست مشہور افسانہ نگار محمد الیاس کے ذریعے صرف میری جواں سال بیٹی کی جواں مرگی کے سبب ایک بہانہ بن گئی۔ ۲۰ راگست ۱۹۹۳ء کو ثمینہ غالب مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی تو مرحوم شبنم رومانی نے سہ ماہی ''اقدار'' (کراچی) میں دعائے مغفرت کی صورت یہ خبر شائع کی۔ خبر محمد الیاس (جو اُن دنوں میر پور آزاد کشمیر میں مقیم تھے) تک پہنچی تو ان کے ذریعے بخاری صاحب نے سنی اور مجھ کو ہمدردی اور غم گساری کا خط لکھتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی کہ وہ میری شاعری کے ذریعے مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔ بس وہ دن اور آج کا دن اُن کی نگاہِ باریک بین نے میری شاعری کے ذریعے مجھے پہچانا۔ ان 20 برسوں کے دوران، پہلے مراسلت اور پھر موبائیل کے ذریعے شناسائی، دوستی میں تبدیل ہوئی پھر ایک انسان میں چھپے ہوئے جوہر کو بخاری صاحب نے ایک کتاب کا روپ دیا جو آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سید مسعود اعجاز بخاری کا تفصیلی تعارف کتاب کے آخری صفحات پر درج ہے۔ ربّ العزت انہیں ایک صحت بخش عمرِ طویل عطا فرمائے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

غالب عرفان